پاکستان کے دیہہ خُدا

اے۔ آر۔ شبلی

PakDigestNovels.Blogspot.Com

پاکستان کے دیہہ خدا

PakDigestNovels.Blogspot.Com

اے۔ آر۔ شبلی

اتش فشاں پبلیکیشنز

غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

دیہہ خدایا' یہ زمیں تیری نہیں' میری نہیں
تیرے آبا کی نہیں' تیری نہیں' میری نہیں

اقبالؒ

کاشت کاروں کی سالانہ آمدنی میں کتنا بڑا تفاوت ہے؟ اس کا اندازہ ذیل کے گوشوارہ سے ہو سکتا ہے جو بورڈ آف اکونامک انکوائری نے 1969ء میں تیار کیا تھا۔ PakDigestNovels.Blogspot.Com

رقبہ	بالمقطع آمدنی	فی کس آمدنی	خرچ
5ء12-ایکڑ تک	17,333روپے	190روپے	191روپے
5ء12-ایکڑ سے 25-ایکڑ تک	" 1,257	" 237	اندازہ نہیں
25-ایکڑ سے اوپر 50-ایکڑ تک	" 3,276	" 683	277روپے
50-ایکڑ سے اوپر اور 150-ایکڑ تک	" 6,774	" 845	" 173

آمد و خرچ کے اس گوشوارہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کے پاس ساڑھے بارہ ایکڑ سے کم زمین ہے وہ اپنا خرچ بھی پورا نہیں کر سکتے اور اس سے زائد رقبہ کے مالک کم سے کم نصف آمدنی (جو ان کے گھریلو اخراجات سے دگنی تگنی ہوتی ہے) الٹے تلّوں میں اڑا دیتے ہیں۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ جہاں پانچ سو روپے ماہوار پانے والے شہری کو انکم ٹیکس قانون کے تحت دھر لیا جاتا ہے وہاں لاکھوں روپیہ سالانہ کمانے والے زمینداروں سے "مالیہ" اور "آبیانہ" کے سوا کچھ بھی وصول نہیں کیا جاتا۔ "مالیہ" اور "آبیانہ" کی شرح چونکہ غیر لچکیلی ہے' اس لیے وہ بھی زمینداروں کے حق میں جاتی ہے۔ مغربی پاکستان میں جب کبھی "زرعی انکم ٹیکس" عائد کرنے کا مطالبہ ہوا اسے حکومت کے مفاد پرست طبقہ نے (جو بڑے زمینداروں پر مشتمل رہا ہے) بڑی بے پروائی سے ٹھکرا دیا۔ اس کے مقابلہ میں کاشت کاروں پر زمینداروں نے جو "ابواب" Cesses عائد کر رکھے ہیں ان کو آج تک منسوخ نہیں کیا گیا۔ 1950ء میں قانونِ مزارعت کے تحت ان وصولیوں کو روکنے کی کوشش کی گئی تو بے دخلیوں کی رفتار میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ بٹائی پر کاشت کرنے والے کو نصف فصل کی آمدنی مالکِ اراضی کے حوالے کرنا پڑتی ہے۔ 1952ء میں مالک اراضی کا حصہ چالیس فیصد کر دیا گیا لیکن اس پر شاذ ہی عمل ہوتا ہے۔ ڈارلنگ نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ کاشت کار کو حقِ مزارعت قائم رکھنے کے لیے زمیندار کو کئی طرح کے نذرانے بھی دینا پڑتے ہیں' مثلاً بیگار' خرچہ' منشیانہ' کمیانہ اور کرایہ۔ اسی طرح بعض علاقوں میں زمینداروں نے چولہا ٹیکس' کھڑکی ٹیکس حتیٰ کہ بھینس یا مرغی ٹیکس بھی عائد کر رکھا ہے۔ کاشتکاروں کو ان نذرانوں سے نجات دلانے کے لیے آج تک جتنی کوششیں ہوتی رہیں سب ناکام رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے بٹائی میں زمیندار کا حصہ عام طور پر 75 بلکہ 90 فیصد ہو جاتا ہے۔ اس کی تصدیق پنجاب بورڈ آف اکونامک انکوائری کے ذریعے ہو چکی ہے اور مسلم لیگ زرعی اصلاحات کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

پاکستان کی زرعی ترقی کے لیے اب تک جو اقدامات کیے گئے ہیں' ان کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ مزارع اور مالک اراضی کے تعلقات کو خوشگوار بنایا جائے اور کھیتی باڑی کی جدید ترین سہولتیں فراہم کر کے

مصنف

PakDigestNovels.Blogspot.Com

کاشتکار سے یہ توقع رکھی جائے کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ مشقت کرکے مالک اراضی کی آمدنی میں اضافہ کرے گا۔ چھوٹے زمینداروں کی اراضی کو قوانینِ وراثت اور بڑے زمینداروں کی چیرہ دستیوں کے باعث ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچانے کے لیے کبھی تحریکِ اشتمال چلا دی جاتی ہے اور کبھی ان کو کیمیاوی کھاد' عمدہ بیج اور کیڑے مکوڑے مار کرنے والی دوائیں استعمال کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ لیکن ان تمام اقدامات کا نتیجہ ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکا جس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ زرعی پسماندگی کے بنیادی اسباب پر غور نہیں کیا جاتا۔ پاکستان زرعی لحاظ سے اگر دوسرے ممالک کا مقابلہ نہیں کرسکا تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہاں کھیتی باڑی کے لیے جدید ترین سہولتیں میسر نہیں بلکہ یہ ہے کہ کاشتکاروں کو ان کی محنت کا پورا صلہ نہیں ملتا اور جس زمین پر ان سے خون پسینہ ایک کرنے کی توقع رکھی جاتی ہے وہ یا تو اتنی قلیل ہوتی ہے کہ ایک وقت کی روٹی بھی پوری نہیں ہوتی یا اس کے مالک وہ خود نہیں ہوتے بلکہ ایسے لوگ بھی ہیں جن کو یہ اراضی انگریزوں نے قومی غداری کے صلہ میں اور پاکستان کے حاکموں نے خوشامد کے عوض انعام کے طور پر دی ہے۔ ان کو اس کے سوا زمین سے کوئی دلچسپی نہیں کہ وہ ان کے شہری اور سیاسی اقتدار کا ذریعہ ہے اور ان کے لیے عیش و آرام کے اسباب مہیا کرتی ہے۔

کالورٹ (Calvert) نے اپنی کتاب "پنجاب کی دولت اور خوشحالی" میں لکھا ہے کہ "دنیا کی بہترین کھیتی باڑی وہ ہے جو مزارعت کے تحت ہو رہی ہے"۔ ظاہر ہے اس کا اشارہ انگلستان کی جانب ہے لیکن اس نے خود تسلیم کیا ہے کہ انگلستان میں جہاں مالک اراضی اپنے کاشتکار کا بہترین رفیق ہوتا ہے اور تقریباً ایک تہائی لگان واپس اپنی زمین پر لگا دیتا ہے وہاں پنجاب کا مالک ایک پائی بھی زمین پر نہیں لگاتا۔ اسی طرح انگلستان اور دوسرے ایسے ممالک میں جہاں کاشتکاری مزارعت کے اصول پر ہوتی ہے زمین عام طور پر مزارعوں کو ٹھیکہ پر دی جاتی ہے اور اس دوران مالک اپنے مزارعوں کے کاموں میں دخل نہیں دیتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مزارع اپنے آپ کو آزاد کسان تصور کرتا ہے اور نہ صرف محنت سے کام لیتا ہے' بلکہ سرمایہ بھی اپنی گرہ سے لگاتا ہے۔ اس کے برعکس مغربی پاکستان میں مالک اراضی نہ تو سرمایہ لگاتا ہے' نہ زمینوں کی دیکھ بھال کرتا ہے بلکہ سب کچھ مفلوک الحال کاشتکاروں کے سپرد کرکے خود ان کی لوٹ کھسوٹ میں مصروف رہتا ہے۔ ان حالات میں زرعی ترقی خاک ہو سکتی ہے۔ مارشل نے ٹھیک لکھا ہے کہ "اگر کاشتکار کو آدھی آمدنی مالک کے حوالے کرنی پڑے تو محنت و سرمایہ لگانے کے لیے اسے کوئی دلچسپی نہ رہے گی"۔ (اصول معاشیات)۔ پنجاب میں اس کی گواہی کالورٹ نے دی۔ وہ لکھتا ہے "میں نے خود دیکھا کہ مزارع نہ تو کھیتی باڑی کے لیے زمین تیار کرنے میں کوئی دلچسپی لیتا ہے' نہ ہل پوری طرح چلاتا ہے' نہ مناسب کھاد ڈالتا ہے اور نہ تمام آلاتِ کشاورزی استعمال کرتا ہے"۔

کاشت کار کو زمین کی پیداوار بڑھانے پر آمادہ کرنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ اس کے حقوقِ ملکیت تسلیم کیے

جائیں۔ اس وقت جو لوگ زمینوں پر قابض ہیں ان میں سے اکثر کسی طرح بھی زمین کے مالک نہیں ہیں۔ انہوں نے یا ان کے آباؤ اجداد نے یہ زمین خریدی نہیں بلکہ قومی غداری یا غیر ملکی حاکموں کی چاپلوسی کے صلہ میں پائی ہے اور اس کا ثبوت سرکاری دستاویزات سے بہ آسانی مل سکتا ہے۔ مسلم لیگ کی زرعی کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں (1948ء) میں لکھا تھا کہ اس علاقہ کا شاید ہی کوئی بڑا زمیندار ہو جو اراضی پر اپنا قبضہ جنگِ آزادی 1857ء سے بھی پہلے کا ثابت کرسکے۔ زیادہ تر زمیندار ایسے ہیں جو انگریز کے "لطفِ توجہ" کی پیداوار ہیں۔

پاکستان میں مزارعت کا سب سے پرانا طریقہ وہ ہے جو مشرقی بنگال کا طریق زمینداری کہلاتا ہے۔ 1765ء میں جب شاہ عالم نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال کی "دیوانی" عطا کی تو کمپنی نے پہلے تو اپنے کارندوں کے ذریعے مالیہ وصول کرنے کی کوشش کی لیکن جب یہ طریقہ ناکام رہا تو اس نے 1772ء کے بعد "دیوانی" نیلام کرنا شروع کر دی۔ جو لوگ بولی دیتے وہ "دیوان" کہلاتے تھے۔ 1793ء میں جب لارڈ کارنوالس نے "بندوبست دیوانی" کا اعلان کیا تو یہی مالیہ وصول کرنے والے ایجنٹ "جاگیردار" یا "زمیندار" کہلانے لگے۔ حالانکہ وہ کسی زمین کے مالک نہیں تھے۔ ان کے ساتھ مالیہ کی رقم طے ہوگئی اور قرار یہ پایا کہ وہ اس کا 10/11 حصہ تو سرکار کے خزانہ میں جمع کریں گے اور 1/11 خود رکھ لیں گے۔ بعد میں ان لوگوں نے بھی اپنے گماشتے مقرر کرلیے جو دیہات میں جاکر مالیہ وصول کرتے اور جاگیردار کو اپنا حقِ خدمت منہا کرکے دے دیتے۔ رفتہ رفتہ گماشتوں کی تعداد بھی بڑھ گئی حتیٰ کہ 1926ء میں سائمن کمیشن نے بتایا کہ "زمیندار" اور "مزارع" کے درمیان اکثر حالات میں پچاس کے قریب دلال موجود ہیں۔ قریب قریب یہی 1940ء میں بنکنگ انکوائری کمیشن نے لکھا۔ لیکن ستم ظریفی کی انتہا یہ کہ اب یہی "دیوان" اور ان کے "دلال" سچ مچ کے زمیندار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور جن زمینوں کا مالیہ وصول کرنے پر وہ مامور ہوئے تھے' ان کی ملکیت کا دعویٰ کرتے ہیں۔

یہی حال پنجاب' سندھ اور سرحد کا ہے۔ 1880ء تک یہ علاقے لق و دق صحرا تھے۔ بمشکل 5 سے 15 انچ سالانہ بارش ہوتی تھی۔ لوگ کہیں کہیں کھیتی باڑی کرتے تھے۔ زیادہ تر علاقہ اونٹوں اور بھیڑوں کی چراگاہ بنا ہوا تھا۔ جب نہریں کھودی گئیں تو انگریز نے سارے علاقے کو "بلا دعویٰ" قرار دے کر اس پر قبضہ کرلیا اور 25-25 ایکڑ کا ایک ایک مربع بنایا اور ان لوگوں میں بانٹ دیا جو قومی غداری کے مرتکب ہوئے تھے۔ یہیں ان لوگوں نے اپنی اپنی نو آبادیاں قائم کرلیں جن میں مزید نہروں کے کھودنے پر رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا گیا۔ اب یہی لوگ "مالکانِ اراضی" کہلاتے ہیں اور جب ان سے "اصلاحات" کے نام پر زمین چھوڑنے کو کہا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ زمین تو ہماری ماں ہے۔ کہیں ماں بھی چھینی یا بانٹی جاسکتی ہے؟

PakDigestNovels.Blogspot.Com

باب 2

انگریز کے درباری

1911ء میں جارج پنجم نے تخت نشین ہونے کے بعد دہلی میں ایک شاہی دربار منعقد کیا تھا جس میں کرسی حاصل کرنے کے لیے بڑی تگ ودو ہوتی رہی۔ برصغیر کے جن مسلمانوں کو اس میں کامیابی ہوئی وہ قدرتی طور پر وہی لوگ تھے جن کو جنگ آزادی 1857ء میں قوم فروشی اور غداری کے عوض انعام واکرام اور خطابات و اراضی کا مستحق سمجھا گیا۔ ذیل میں مسلمان درباریوں کی مکمل فہرست شائع کی جارہی ہے۔ ان میں سے اکثر کی اولاد قیام پاکستان کے بعد یا تو بڑے بڑے عہدوں پر متمکن رہی ہے یا وسیع قطعاتِ اراضی اور جائیدادوں پر قابض ہے۔

1- میرزا ثریا جاہ ولد میرزا الٰہی بخش (دہلی)
2- نواب ابراہیم علی خان ولد محمد علی خان کنج پورہ (کرنال)
3- نواب عظمت علی خاں ولد نواب احمد علی خاں منڈل (کرنال)
4- سید یعقوب خاں تورہ (سفیر یارقند)
5- سعادت علی خاں ولد قطب الدین خاں منڈل (کرنال)
6- محمد عنایت علی خاں ولد دلاور علی خاں (مالیر کوٹلہ)
7- احسن علی خاں ولد غلام محمد خاں (مالیر کوٹلہ)
8- میر محمد باقر علی خاں (سی-آئی-ای) ولد قاسم علی خاں (انبالہ)
9- عالم خاں ولد عطا محمد خاں (کوٹلہ ننگ)
10- خان بہادر شمشیر علی خاں ولد وزیر علی خاں منڈل (کرنال)
11- محمد سراج الدین حیدر خاں ولد کیپٹن محمد تفضل خاں، فرخ نگر (گڑگاؤں)
12- منشی حسین بخش (انبالہ)
13- میرزا اقبال شاہ ولد میرزا الٰہی بخش (دہلی)
14- سعید الدین احمد خاں ولد نواب ضیاء الدین احمد خان (دہلی)
15- خان بہادر ہادی حسین خاں ولد سید محمد بخش خاں (دہلی)
16- خان بہادر محبوب بخش ولد شاہ محمد شیخ (دہلی)

17- خان بہادر نظام الدین خاں ولد محمد حیات خاں (دہلی)
18- شیخ عبدالرسول ولد شیخ انعام اللہ (فرید آباد) ریٹائرڈ (ای-اے-سی)
19- احمد حسین خاں ولد محمود حسن خاں، گنج پور (کرنال)
20- میر محمد ہادی علی ولد میر نظام علی (گڑگاؤں)
21- خان بہادر مولوی ضیاء الدین خاں (ای-اے-سی) ولد محمد بخش خاں (گڑگاؤں)
22- حکیم غلام رضا خاں ولد غلام مرتضیٰ خاں (دہلی)
23- احمد شفیع ولد میر قاسم علی (فرید آباد)
24- سید سلطان میرزا (آنریری مجسٹریٹ) ولد نواب سید سردار میرزا
25- حکیم ظہیر الدین (آنریری مجسٹریٹ) ولد غلام نجف خاں (دہلی)
26- عمر علی خاں ولد رسالدار بشارت علی، اکھوڑہ (رہتک)
27- قمر الدین ولد شمس خاں (سرسہ)
28- مہر علی خاں ولد حیدر علی خاں، گوہانہ (رہتک)
29- قمر الدین خاں غلام شرف خاں منڈل (کرنال)
30- سید ابوالحسن سجادہ نشین ولد سید آدہم علی شاہ (سدھوڑہ)
31- غلام رسول خاں ولد سمند خاں، کلانور (رہتک)
32- رسالدار سہراب خاں ولد سمند خاں، کلانور (رہتک)
33- شہزاد خاں ولد قمر الدین خاں، کلانور (رہتک)
34- جمعدار سردار خاں ولد دیندار خاں آف حصار
35- مولوی لطیف حسن خاں (ہیڈ عربک ٹیچر گورنمنٹ سکول دہلی) ولد حکیم محمد حسین خاں (دہلی)
36- محمد اکرام اللہ خاں (ای-اے-سی-آنریری) ولد بخشی انعام اللہ خاں
37- شہزادہ نادر (سی-آئی-ای) ولد شاہ شجاع الملک (لدھیانہ)
38- شہزادہ صفدر جنگ ولد شاہ شجاع الملک
39- شہزادہ سلطان جلال الدین ولد شہزادہ تیمور
40- نواب غلام قطب الدین ولد نظام الدین ممدوٹ
41- محمد طاہر ولد شہزادہ سلطان سکندر
42- راجہ نعمت اللہ خاں ولد راجہ حمید اللہ خاں، رہلو (کانگڑہ)
43- کرامت اللہ خاں ولد راجہ حمید اللہ خاں، راجوری آف رہلو (کانگڑہ)

44- سردار یار محمد خان ولد سردار صالح محمد خاں

45- سردار نور محمد خاں ولد سردار حسن خاں (لدھیانہ)

46- فیض طالب خاں ولد راؤ امام بخش، رائکوٹ (لدھیانہ)

47- سید شریف حسین ولد مولوی رجب علی جگراؤں

48- مسقدی خان ولد بلاقی خان (لدھیانہ)

49- سردار سلطان جاں ولد شہزادہ محمد جمہور (کوہاٹ)

50- خان بہادر محمد ظفر خاں خٹک ولد نواب سر خواجہ محمد خان بہادر خٹک آف تیری (کوہاٹ)

51- نواب سر محمد اکرم خاں آف امب ولد جاندار خاں (ہزارہ)

52- راجہ جہانداد خاں خان بہادر ولد راجہ حیدر بخش خاں (ہزارہ)

53- نواب لیفٹیننٹ کرنل سردار محمد افضل خاں رسالدار میجر (پشاور)

54- سردار سلطان ابراہیم خان بہادر ابن سردار اُدھم خاں

55- ارباب محمد حسین خاں ولد نواب سرفراز خاں، مہمند (پشاور)

56- سلطان برکت خاں بوٹے ولد رحمت خاں

57- راجہ فیروز خاں ولد راجہ علی گوہر خاں (خانپور)

58- محمد حسین خاں ولد سمندر خاں (گڑھی حبیب اللہ)

59- محمد عباس خاں وزیر زادہ ولد نظام الدولہ وزیر شاہ شجاع الملک

60- سردار محمد اکبر خان برادر محمد عباس خاں متذکرہ بالا

61- لیفٹیننٹ کرنل محمد اسلم خاں وزیر زادہ سردار بہادر برادر متذکرہ بالا

62- خان بہادر محمد ابراہیم خاں ولد صفدر خاں (مردان)

63- قاضی عبدالقادر خاں ولد قاضی فضل قادر (پشاور)

64- اللہ یار خاں مرودخیل ولد غلام حیدر خاں آف ہانگو

65- خان فتح محمد خاں خٹک ولد خان بہادر جعفر خان منگوریہ

66- سید میر اکبر خاں ولد سید محمود شاہ تیراہ، قبائلی علاقہ

67- سید محمد امین جاہ ولد علاء الدین ماروزئی (پشاور)

68- عبدالرحمان خاں ولد عبداللہ خاں پھلارہ (ضلع ہزارہ)

69- محمد اعظم خاں ولد محمد سربلند خاں، مہمند (کوٹلہ محسن خاں)

70- سید محمد خاں ولد علی بہادر خاں دوبران (ہزارہ)

71- امین اللہ خاں ولد محمد عثمان خان اورک زئی (پشاور)

72- سردار آزاد خاں ولد سردار حسن علی منال

73- محمد خاں سردار بہادر ولد محمد حسن خاں

74- خان زمان خان ولد میرزمان خان (ہزارہ)

75- خان بابا خان بہادر ولد سردار بہادر خان (پشاور)

76- ارباب فتح خاں ولد ارباب جہانگیر خاں خلیل

77- فرید خاں ولد ارباب عبدالمجید خاں

78- محبت خاں ولد قادر خاں تورو

79- سردار نور محمد خاں ولد سردار حسن خاں لدھیانوی (کوہاٹ)

80- ارباب عبدالخالق خاں ولد ارباب شاہ پسند خاں گل بیلا

81- خواجہ محمد خاں ولد سربلند خاں آف ہوتی

82- سردار عزیز برق زئی ولد سلطان محمد خاں آف بہادر کوٹ

83- شیر محمد خاں کیانی ولد غلام حیدر خاں شاہ پور

84- نواب زادہ عبدالغفور خاں خٹک ولد نواب سر خواجہ محمد خاں تہری

85- عمر خاں خان بہادر بنگش مرودخیل ولد خان بہادر محمد امین خاں در سمند

86- شریف خاں ولد عزیز خاں ہمزہ کوٹ

87- عبدالغفار خاں ولد ابراہیم خاں زیدہ

88- عمر خاں سردار سلا خان آف زیدہ

89- عمر خاں ولد امیر خاں شیوہ

90- اکبر خاں ولد نبی میری غازاں ٹوپی

91- ارباب عبدالرؤف خاں ولد نبی حبیب اللہ خاں

92- قاضی فضل الٰہی ولد قاضی فیض عالم سکندر پور (ہزارہ)

93- حبیب خاں سردار بہادر ولد نوبت خاں کندی

94- لطیف خاں بہادر، رسالدار ولد حضرت خاں شاہ ترنگ زئی

95- سلیم خاں دودوسی (ریٹائرڈ میجر) ولد حضرت خاں شاہ ترنگ زئی

96- آفریدی خاں ولد امیر خاں بلازئی

97- محمد جان ولد مولوی آف کافر تہری

98- محمد علی خاں ولد رسول خاں جہانگیرہ
99- غلام محمد خاں ولد خان بہادر فتح خاں خٹک جہانگیرہ
100- تاج محمد خاں ولد خانزادہ محمد خاں (کوہاٹ)
101- محمد عظیم خاں خٹک عرف یاسین خاں ولد نواب سرخواجہ محمد خاں تہری
102- قاضی امین جان ولد قاضی سعد اللہ جان (پشاور)
103- میاں حسین شاہ کاکاخیل
104- دوست محمد ولد نواب خاں ست گری
105- شاہ داد خاں ولد خداداد خاں بندہ پیر خاں
106- اسلم خاں خیل ولد سمند خاں
107- گلیر ولد احمد شیر مہمند۔ پنج پاؤ
108- آفتاب گل ولد عبدالرحمان میاں آبوزئی
109- دوست محمد ولد میر افضل خاں گڑھی دولت زئی
110- اکبر خاں ولد اللہ داد خاں (اسماعیلیہ)
111- شریف میاں ولد میاں محمد شاہ
112- علی اکبر خاں ولد قلندر خاں کلابت
113- عمر میاں ولد سید رسول اسماعیلیہ
114- قاضی میر عالم ولد قاضی غلام احمد سکندر پور (ہزارہ)
115- غلام حیدر خاں دہریال ولد عطا محمد خاں
116- عطا محمد خاں ولد حکم خاں
117- مخدوم غلام محمد ولد میر احمد، کوٹ نجیب اللہ
118- شیخ محمد اکبر ولد شیخ مظفر خاں
119- قاضی محمد خاں ولد قاضی نجیب خاں
120- پیر دوست خاں ولد نواب خاں، پنڈیالی
121- امیر خاں ولد مظفر خاں نندھار
122- میاں انور الدین ولد برہان الدین، سرادھ تیری
123- سعد اللہ خاں محمد ولد ارباب محمد خاں
124- عبداللہ خاں ولد ہستن خاں عمرزئی

125- نصر اللہ خاں ولد میر امان خان شب قدریہ
126- سید عبدالمنان بادشاہ ابن عبدالرحمان
127- شاہباز خاں ولد الف خاں، اتمان زئی
128- نصر اللہ خاں ولد خوشحال خاں، امبہ
129- سلطان خاں ولد نصیر خاں خلیل، شاہی بالا
130- ملک محبوب خاں ولد سکندر خاں، مٹھہ خیل
131- فتح خاں ولد ترسوم خاں، خوزند
132- میاں راحت شاہ کاکاخیل ولد مقدر شاہ زیارت
133- اعظم خاں ولد شجاع اللہ خاں خوزند
134- عنایت اللہ خاں ولد سربلند خاں
135- اکبر خاں ولد غفار خاں، گدڑپور
136- محمد خان ولد خیر اللہ خاں، کھٹیالیہ
137- عطا علی ولد مدد خاں
138- سرور خاں ولد محمد خاں مان پور
139- ملک جان کیانی ولد برہان حیدر خاں کیانی، شاہ پور
140- شریف اللہ خاں ولد امیر اللہ خاں چمکانی
141- سید احمد شاہ بنوری ولد سید مبارک شاہ بنوری
142- سید سکندر شاہ بنوری ولد سید مبارک بنوری
143- نوابزادہ سیدل خاں بنگش ولد نواب بہادر
144- شیر خاں بلند خاں ولد امیر حمزہ خاں امیر
145- سید معصوم گیلانی ولد سید گل بادشاہ بنوری
146- حیدر خاں ولد محمد امین خاں درسمند
147- فیض اللہ خاں ولد ارسلا خاں
148- حیدر شاہ میاں ابن باور میاں
149- میر حسن خاں ولد جہانگیر خاں تنگی
150- میر فضل علی شاہ ولد میر تقی شاہ
151- بہادر شاہ ولد فتح علی شاہ کاغان

152- احمد علی شاہ ولد میر گل شاہ پلوسی

153- ستار شاہ ولد غلام شاہ پلوسی

154- محمد حسین خان ولد فیض طالب خاں مانسہرہ

155- صوبیدار میجر سعد اللہ خاں ولد حاجی خان شیروال

156- احمد خاں ولد قائم خاں پنیاں

157- بہرام خاں ولد قادر خاں تورو

158- قاضی ملا محمد ولد قاضی محمد حسین خاں پشاور

159- محمد زمان خاں خٹک ولد سمندر خاں اکوڑہ

160- خان بہادر میاں غلام رسول ولد میاں محمد اعظم

161- صوبیدار میجر ضامن شاہ ولد احمد شاہ مردان

162- رسالدار میجر میرالانا خاں ولد محمد میر خاں چکانی

163- سید میر اصغر خاں برادر میر اکبر خاں (تیرہ سید فیملی)

کمیدی

باب 3

قوانینِ مزارعت

انگریز نے اپنے حمائتیوں اور وفاداروں کو خوش کرنے کے لیے جو نظامِ اراضی بنایا اس سے قدرتی طور پر کاشت کاروں اور مزارعوں میں بے چینی پیدا ہو گئی جو مختلف وقتوں میں لڑائی جھگڑے اور فساد کی صورت میں ظاہر ہوتی رہی۔ لیکن بجائے اس کے کہ بے چینی کے حقیقی اسباب کو دور کیا جاتا' قوانینِ مزارعت کے ذریعے سے زمیندار اور مزارع کے تعلقات کا تعین کرنے پر اکتفا کیا گیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا قانون 1859ء میں "بنگالی لگان ایکٹ" کے نام سے وضع ہوا جس میں 1885ء میں ترمیم کر دی گئی۔ اس قانون کی رو سے جو مزارع کسی گاؤں میں بارہ سال تک کاشت کرتا اسے موروثی قابض کے حقوق مل جاتے اور جب تک اس کے خلاف عدالتی ڈکری (Decree) جاری نہ ہوتی' اسے بے دخل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس قانون کے تحت پانچ سال تک لگان میں بھی اضافہ نہیں ہو سکتا تھا۔ بعد ازاں زمینداروں کو سہولتیں دینے کے لیے اسی قانون میں وقتاً "فوقتاً" ترمیم ہوتی رہی لیکن مزارعین کا اضطراب دور نہ ہو سکا۔

1942ء میں سندھ کے ہاریوں نے ایجی ٹیشن کی تو حکومت نے ایک کمیٹی قائم کر دی جس نے یہ سفارش کی کہ جو ہاری مسلسل آٹھ برس تک ایک ہی زمیندار کی کم سے کم چار ایکڑ زمین پر کاشت کرتا رہے اسے حقوقِ مزارعت دے دیے جائیں۔ کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی کہ ہاری کو صرف اس صورت میں بے دخل کیا جائے کہ وہ ذاتی طور پر کاشت نہ کرے یا لگان ادا نہ کرے یا کھیت سے ایک میل کے فاصلہ کے اندر رہائش رکھنے کو تیار نہ ہو یا کسی جرم میں ماخوذ ہو جائے' لیکن کمیٹی کی اس رپورٹ پر کوئی کارروائی نہ ہوئی۔ مارچ 1947ء میں سر راجر ٹامس (ایک زمیندار) کی سرکردگی میں ایک اور کمیٹی قائم کی گئی جو ہاری کمیٹی کے نام سے مشہور ہے اور جس کی رپورٹ میں (بھگوان) مسعود نے ایک اختلافی نوٹ شامل کرنا چاہا تھا لیکن وہ شائع نہ ہو سکا۔ اس کمیٹی کی رپورٹ کا خلاصہ یہ ہے کہ سندھ کے ہاریوں کو اگر کوئی تکلیف ہے تو اس کا ذمہ دار وہ خود ہے ورنہ مالکانِ اراضی تو اس کے دوست ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہاری "ناشکرا" ہے اور زمیندار کے "احسانات" کو تسلیم نہیں کرتا۔ کمیٹی نے ہاریوں کو مستقل حقوقِ کاشت دینے پر اعتراض کیا۔ تاہم ارکان کی اکثریت نے یہ تجویز پیش کی کہ حکومت بٹائی کو باقاعدہ بنانے اور ہاریوں کو حقوق دینے کے لیے مزارعوں کے حقوق کا قانون منظور کرے۔ چنانچہ 1950ء میں سندھ قانونِ مزارعت نافذ ہوا جس میں مزارعوں سے بیگار اور نذرانے لینے کی ممانعت کر دی گئی۔ جو مزارع کم از کم تین سال تک ایک ہی مالک کے چار ایکڑ رقبہ پر کاشت کرے' اس کے مستقل حقوقِ

مزارعت بھی تسلیم کر لیے گئے۔ تاہم یہ قانون مزارعوں کو پوری طرح تحفظ دینے میں ناکام رہا۔

پنجاب میں 1950ء تک 1887ء والا قانونِ مزارعت ہی رائج تھا' جو موروثی مزارعوں کے حقوق تو تسلیم کرتا ہے لیکن غیر موروثی مزارعوں کو کوئی تحفظ نہیں دیتا۔ مارچ 1949ء میں حکومت پنجاب نے ملک فیروز خان نون کی صدارت میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی۔ ملک صاحب مرحوم چونکہ خود ایک بہت بڑے زمیندار تھے' اس لیے وہ اس کے سوا کچھ نہ کر سکے کہ غیر موروثی مزارعوں کو ایک حد تک تحفظ عطا کر دیں اور ناجائز وصولیاں بند کرنے کی سفارش کریں۔ اس کمیٹی کی رپورٹ کی بنا پر 1950ء اور 1952ء میں جو زرعی اصلاحات نافذ کی گئیں' ان کا مقصد بے دخلیوں کو روکنا اور مزارعوں کو تحفظ دینا تھا۔ بایں ہمہ یہ شکایات بدستور پیدا ہوتی رہیں کہ مالکِ اراضی پیداوار کی رسید نہیں دیتے یا کھیت سے اپنے حصے کی فصل نہیں اٹھاتے اور بٹائی نہ کرنے کے الزام میں بے دخلی کی درخواست دے دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ مقررہ میعاد تک کاشت کرنے کے باوجود مزارع کو تحفظ حاصل نہیں۔ مالکِ اراضی اس سے لمبی مدت کے معاہدے کر کے بدستور کام لیتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ خود کاشت اراضی پر ان قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا۔ 1952ء کے قانونِ مزارعت کے تحت موروثی کاشت کاروں کو بھی حقوق ملکیت دیے جا سکتے ہیں۔ مالک اراضی کا حصہ پچاس فیصد سے گھٹا کر چالیس فیصد کر دیا گیا ہے اور خود کاشت اراضی کے بارے میں بھی ہدایات جاری کر دی گئی ہیں۔ پنجاب میں مزروعہ رقبہ کا سات فیصد موروثی کاشتکاروں کے پاس ہے۔ ان میں سے بعض اجناس کی صورت میں لگان ادا کرتے ہیں اور بعض مالیہ کے فی روپیہ دو آنے سے آٹھ آنے تک "مالکانہ" دیتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان زرعی اصلاحات کے تحت بعض موروثی کاشتکاروں کو حقوقِ ملکیت مل رہے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی یہ رفتار بہت سست ہے۔

اسی قانون کے تحت کوئی مالکِ اراضی (جو ایک ایکڑ سے زائد اراضی کا مالک ہو) خود کاشت کے لیے پچاس ایکڑ نہری' پچھتر ایکڑ نیم نہری اور سو ایکڑ غیر نہری سے زائد رقبہ اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ (سو ایکڑ سے کم مالکان اراضی کے لیے نہری رقبہ کی حد پچیس ایکڑ ہے) لیکن زمیندار پہلے تو خود کاشت کے رقبہ کے اطلاق ہی سے گریز کرتے رہے' اس کے بعد ان میں سے اکثر نے چالیس فیصد لگان اور بے دخلی کے قوانین پر عمل کرنا چھوڑ دیا تھا۔

پنجاب کی مجلسِ قانون ساز نے اپنے جنوری 1952ء کے اجلاس میں جو زرعی اصلاحات کے بل پاس کیے' ان کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

(الف) 1- تمام ایسے موروثی مزارعین جو زمیندار کو سرکاری موجبات کی رقوم کے سوا کوئی اور لگان نہ دے رہے ہوں' مالکان کو کسی قسم کا معاوضہ دیے بغیر اپنی زمینوں کے مالک بن جائیں گے۔

2- اگر موروثی مزارعین پیداوار کا کوئی حصہ بطور لگان دے رہے ہوں تو وہ اراضی کے اتنے حصے

کے مالک بن جائیں گے جو ان کے حصۂ پیداوار کے مطابق ہو گا۔ اس کے لیے بھی انہیں معاوضہ مالک کو نہیں دینا پڑے گا۔

3- ایسے موروثی مزارعین جو لگان نقدی کی صورت میں ادا کر رہے ہوں یا کچھ حصہ نقدی کی صورت میں اور کچھ پیداوار کی صورت میں دے رہے ہوں' معاوضہ دے کر مالک بن جائیں گے۔ اس سلسلے میں حکومت معاوضہ کی رقم اور صورت کا تعین کرنے کے لیے قواعد وضع کرے گی۔ قانون میں یہ گنجائش رکھی گئی ہے کہ معاوضہ ادا کرنے کے لیے حکومت موروثی مزارع کو روپیہ قرض دے دے اور اسے بعد میں بقایا جات مالیہ اراضی کی شکل میں آسان قسطوں میں وصول کر لے۔

4- آئندہ کوئی موروثی مزارعت قائم نہیں ہو گی۔

(ب) 1- سو ایکڑ سے زیادہ اراضی کے مالک کے لیے یہ ضروری ہو گا کہ وہ پچاس ایکڑ نہری یا سو ایکڑ غیر نہری زمین خود کاشت کے لیے مخصوص کر کے باقی زمین مزارعین کو کاشت کے لیے دے۔ خود کاشت کے مخصوص کرنے کی آخری تاریخ 3 جنوری 1953ء ہے۔

2- اگر سو ایکڑ سے زیادہ اراضی کا مالک ایکٹ کے نفاذ کے وقت پاکستان کی فوجی ملازمت میں ہو تو اسے ایسی ملازمت سے سبکدوش ہونے سے چھ ماہ کے اندر اندر مقررہ خود کاشت رقبہ سے زائد اراضی مزارعین کو لگان پر دینا پڑے گی۔

3- اگر کسی شخص کو' جسے متذکرہ بالا ضمن کے تحت مزارعین کو اراضی دینے کا حکم ملا ہو' مناسب مزارعین نہ مل سکیں تو اس کے لیے لازم ہو گا کہ وہ اپنے ضلع کے حاکمِ مال کو درخواست دے۔ حاکمِ مال اس کے لیے مزارع تلاش کرے گا۔ جب مزارع دستیاب ہو جائیں تو مالک کے لیے ضروری ہو گا کہ انہیں فی الفور متعلقہ اراضی کا قبضہ دے دے۔

4- اگر کسی شخص کے پاس سو ایکڑ سے کم اراضی ہو تو وہ اپنی تمام زمین' جسے وہ خود ہی بوقت نفاذ ایکٹ (4 فروری 1952ء) کاشت کر رہا ہو' خود ہی کاشت کرتا رہے گا۔ اسے زمین کا کوئی حصہ کسی مزارع کو نہیں دینا پڑے گا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو 25- ایکڑ سے زائد زمین کو خود کاشت بنانے کے لیے وہ کسی مزارع کو بے دخل نہیں کر سکے گا۔

5- خود کاشت کے لیے جو زمین زمیندار مخصوص کر سکے گا' وہ موجودہ باغ یا باغات یا بنجر قدیم کے علاوہ ہو گی۔ لیکن اگر زمیندار خود کاشت کے لیے زمین مخصوص کرنے کے بعد اس میں باغ لگا دے تو اس باغ کی زمین کو خود کاشت کی مقررہ حد کے علاوہ شمار نہیں کیا جائے گا۔

6- زمینوں کو خود کاشت کرنے کے لیے مخصوص کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس زمین کو

مالک خود ضرور کاشت کرے۔ ایسی مخصوص زمین مزارعوں کو دی جائے تو ایسے مزارعوں کو مستقل حقِ مزارعت حاصل نہ ہو گا۔

7- اگر مالک زمین ایک دفعہ کسی زمین کو خود کاشت کے لیے چن لے تو وہ اسے پھر کسی اور زمین سے نہیں بدل سکتا اور اگر خود کاشت کے لیے مخصوص کی ہوئی زمین کا کوئی حصہ کسی اور کے نام منتقل کر دے تو اس کی جگہ اپنے باقی خود کاشت رقبے کو بڑھا نہ سکے گا۔ البتہ اس کو رقبہ کے ساتھ تبدیل کرنے کا حق ہو گا جس میں وہ بعد ازاں حقوق ملکیت وراثت میں حاصل کرے۔ لیکن اگر اس طرح مخصوص شدہ زمین یا اس کا کچھ حصہ حکومت نے قانوناً" حاصل کر لیا ہو یا دریا بُرد ہو گیا ہو یا اس اراضی کا پچاس فیصد یا زیادہ سیم یا تھور کی وجہ سے ناقابل کاشت ہو جائے تو وہ اپنی ملکیت میں سے اپنے لیے اتنی زمین اور لینے کا حقدار ہو گا جتنی ملا لینے سے کل قابل کاشت رقبہ پھر پچاس ایکڑ ہو جائے۔ سیم اور تھور کی زد میں آئی ہوئی جو زمین قابل کاشت ہو اس کی بجائے مزید زمین حاصل نہیں کی جا سکے گی۔

8- مویشیوں اور گھوڑوں کی پرورش کے جو فارم حکومت کے تسلیم شدہ ہیں' ان کی اراضی اس پابندی سے آزاد ہو گی۔ اس قسم کے فارموں کی زمین اس سے قطع نظر کہ اس کا رقبہ کتنا ہے' مالک کے خود کاشت رقبے ہی میں شمار ہو گی۔ لیکن اس قسم کے فارم کے مالک کو فارم کی زمین کے علاوہ اور زمین رکھنے کا حق نہیں ہو گا خواہ اس فارم کا رقبہ 50- ایکڑ سے کم ہی کیوں نہ ہو۔

9- اگر کسی شخص کے پاس 25- ایکڑ یا اس سے زیادہ زمین ہو تو اسے بحیثیت مزارع کوئی زمین نہیں دی جائے گی اور کوئی مزارع 25- ایکڑ سے زیادہ زمین اپنے قبضے میں بحیثیت مزارع نہیں رکھ سکے گا۔ حکومت کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کسی شخص یا اشخاص کے طبقے کو یا کسی زمین یا اراضیات کی قسم کو ان احکام و شرائط سے مستثنیٰ قرار دے سکے۔ مزید یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ باقبضہ اراضی کا مرتہن' سرکاری زمین کا مزارع جس نے حقوق ملکیت حاصل نہ کیے ہوں' پٹہ دار یا متروکہ زمین کا الاٹی بھی اس دفعہ کی اغراض کے لیے مالک تصور کیا جائے گا۔

10- لگان ادا نہ کرنے کی مہم میں حصہ لینے کو ایسی جائز وجہ شمار نہیں کیا جائے گا جس کی بنا پر کسی مجاز عدالت میں کسی مزارع کو بے دخل کرانے کی کوشش کی جا سکے گی۔

(ج) 1- کوئی مالک اب زمین کی پیداوار کے چالیس (40) فیصد حصے سے زیادہ لگان وصول نہیں کر سکے گا۔ اگر کوئی مزارع چالیس (40) فیصد سے کم لگان دے رہا ہے تو اس سے لگان بڑھانے کا مطالبہ نہیں کیا جا سکے گا۔ کسی زمین پر جو بھی سرکاری مواجب عائد ہوتے ہیں یعنی مالیہ' آبیانہ' مقامی شرح اور دیگر محاصل (سوائے اس ٹیکس کے جو شہری جائیداد غیر منقولہ پر عائد ہوتا ہے)

وہ زمیندار یا مزارع کو اسی تناسب سے مشترکہ طور پر ادا کرنے ہوں گے جس تناسب سے زمین کی پیداوار ان میں تقسیم ہو گی۔ مگر مزارع کسی صورت میں بھی ساٹھ فیصد سے زیادہ حصہ ادا نہیں کرے گا۔

2- اگر اس قانون کے نفاذ کے وقت مزارع سرکاری مواجب کا کوئی حصہ ادا نہ کر رہا ہو تو اسے نفاذ کے بعد بھی کوئی حصہ نہیں دینا پڑے گا۔ اگر مزارع پیداوار میں اپنے حصے سے کم تناسب میں سرکاری مواجب ادا کر رہا ہو تو اس سے زیادہ ادائیگی کا ذمہ دار نہیں ہو گا البتہ اگر پیداوار میں اس کا حصہ نئے قانون کی بدولت پچاس (50) فیصد سے بڑھ کر ساٹھ فیصد ہو جائے تو اسے سرکاری مواجب کا دس فیصد حصہ ادا کرنا پڑے گا' بشرطیکہ اس اضافے سے اس کا کل حصہ سرکاری مواجب میں ساٹھ فیصد سے بڑھنے نہ پائے۔

3- جہاں مزارع اور مالک کا حصہ مواجبِ سرکار میں پہلے ہی ساٹھ اور چالیس فیصد مقرر تھا اور مزارع ساٹھ فیصد سے زیادہ ادا کرتا تھا' وہاں اب ساٹھ فیصد سے زائد ادائیگی کا بوجھ زمیندار کو اٹھانا ہو گا۔

4- جہاں مزارع اور زمیندار پیداوار کو دو تہائی اور ایک تہائی کی نسبت سے تقسیم کرتے تھے وہاں بالعموم مزارع تمام سرکاری مواجب کی ادائیگی کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ نئے قانون کے تحت وہ سرکاری مواجب کا صرف دو تہائی ادا کرے گا' باقی رقم زمیندار کو ادا کرنا پڑے گی۔

(د) اگر کوئی ایسا مزارع' جو زمین پر کسی مقررہ مدت کے لیے قابض نہیں ہے' فوت ہو جائے اور وہ زمین اس رقبے میں شامل نہیں ہے جو زمیندار نے خود کاشت کے لیے مخصوص کی ہوئی ہے تو وہ زمین مزارع کے نرینہ بچے کو مل جائے گی جسے اس نے تحریری طور پر نامزد کر دیا ہو۔ اگر ایسی نامزدگی موجود نہ ہو تو مزارعت متوفی کے سب سے بڑے نرینہ بچے کے نام منتقل ہو گی' لیکن اگر متوفی مزارع کے اولاد نرینہ نہ ہو تو حقوق مزارعت ختم ہو جائیں گے۔

(ہ) مندرجہ ذیل جرائم قابل سزا سمجھے جائیں گے اور ان کے لیے ایک سال کی قید اور جرمانہ کی سزا یا دونوں ہو سکیں گی۔

1- اگر کوئی مالک مزارع سے اس بیج کے علاوہ' جو مستعار دیا گیا ہو' کچھ زائد وصول کر لے۔

2- اگر مالک اپنے مقررہ لگان کے علاوہ کوئی وصولی' خرچ' محصول' محصول دیہہ یا نذرانے وغیرہ کی صورت میں کرے۔

3- اگر مالک قانون کے خلاف مزارع کو بے دخل کرے۔

4- اگر کوئی زمیندار خود کاشت کے مقررہ رقبہ سے زائد اراضی مزارعین کو نہ دے یا حاکمِ مال کو

اس امر کی اطلاع نہ دے کہ اس کے پاس اتنی زمین زائد ہے۔

5- مزارع کو صرف اس صورت میں سزا دی جا سکتی ہے جبکہ کسی حاکم مجاز نے اس کی بے دخلی کا حکم صادر کر دیا ہو اور وہ بے دخل ہونے سے انکار کرے۔

قانون تنسیخِ جاگیرات پنجاب کی رو سے قانون کے نفاذ کے وقت نقدی کی صورت میں جو جاگیریں دی جا رہی تھیں، وہ تمام کی تمام منسوخ ہو جائیں گی لیکن جو جاگیریں قومی خدمات کے عوض دی گئی ہوں یا مذہبی یا خیراتی اداروں کی خاطر ہوں گی، انہیں منسوخ نہیں کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اس قانون کی رو سے آئندہ جاگیر بخشی ختم کر دی گئی ہے۔

قانون (ترمیم) انہار خود کی رو سے حکومت نجی ملکیت کی طغیانی کی نہروں کو بلا معاوضہ اپنی ملکیت میں لے سکے گی اور اگر چاہے تو ان کی جگہ ایک مستقل نہر بنا سکے گی۔ اس قسم کی نجی ملکیت کی نہریں زیادہ تر ضلع شاہ پور میں ہیں جہاں تقریباً باون ہزار ایکڑ رقبہ ان کے تحت ہے۔

1951ء کا قانون دراصل دولتانہ وزارت کی زرعی اصلاحات کا کرشمہ ہے۔ اول تو یہ اصلاحات ہی نامکمل تھیں دوسرے ان پر عمل بھی بے دلی سے ہوتا رہا۔

باب 4

ایوبی اصلاحاتِ اراضی

1959ء میں صدر ایوب نے مغربی پاکستان کے تمام صوبوں میں جو زرعی اصلاحات نافذ کیں، ان کی رو سے ملکیتِ اراضی کی حد چھتیس ہزار پیداواری یونٹ مقرر کی گئی جو نہری رقبہ کے پانچ سو ایکڑ اور غیر نہری رقبہ کے ایک ہزار ایکڑ کے برابر تھی۔ اس کے علاوہ بارہ ہزار پیداواری یونٹ عطیہ کے طور پر دیے جا سکتے تھے اور ڈیڑھ سو ایکڑ باغات کے تحت رکھے جا سکتے تھے۔ مغربی پاکستان میں سب سے بڑا زرعی رقبہ ساڑھے تین لاکھ ایکڑ ہے۔ زرعی اصلاحات کے تحت جو ضبطی عمل میں لائی گئی اس سے چھ ہزار کے قریب مالکانِ اراضی متاثر ہوئے اور ان سے دو لاکھ تیس ہزار ایکڑ کے قریب زمین حاصل کی گئی۔ اس کے علاوہ ستر ہزار ایکڑ زمین جاگیرداروں سے لے لی گئی۔ اس طرح بحیثیت مجموعی تین لاکھ ایکڑ رقبہ بحق سرکار ضبط کر لیا گیا۔ لیکن بلا معاوضہ نہیں، اس کے لیے ایک روپیہ سے پانچ روپیہ فی پیداواری یونٹ معاوضہ طے ہوا جو "وراثتی بانڈ" کی صورت میں منتقل کر کے اس پر چار فیصد سالانہ سود ادا کیا جا رہا ہے۔ یہ رقم سٹیٹ بنک کے کھاتہ میں "عوامی قرض" کے نام سے ڈال دی گئی ہے۔

صدر ایوب کی ان زرعی اصلاحات کے جو نتائج اب تک منظرِ عام پر آئے ہیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

1- بہت سے مالکان اراضی ایسے ہیں جن کے پاس ابھی تک چھتیس ہزار پیداواری یونٹ سے زائد زمین موجود ہے۔

2- بارہ ہزار پیداواری یونٹ چونکہ عطیہ کے طور پر دیے جا سکتے تھے اور ڈیڑھ سو ایکڑ کو باغات میں منتقل کیا جا سکتا تھا اس لیے کوئی مالک اراضی خسارے میں نہیں رہا کیونکہ عطیہ اپنے بیوی بچوں یا رشتہ داروں کے پاس رہا اور باغات سے آمدنی میں اضافہ ہو گیا۔

3- مالکان اراضی نے جو زمین ضبط کرائی ہے وہ عام طور پر بنجر اور ناممکن ہے جس کا معاوضہ انہوں نے زرخیز زمین کے حساب سے وصول کیا ہے لہٰذا زرعی اصلاحات سے وہ فائدے میں رہے کیونکہ عام حالات میں شاید یہ زمین اتنے اچھے داموں فروخت نہ ہو سکتی۔

4- معاوضہ کی سرکاری کفالتوں کی صورت میں منتقل کرنے سے مالکانِ اراضی کے لیے ایک لمبے عرصے تک معقول آمدنی کی صورت پیدا ہو گئی۔

5- بہت سے مالکان اراضی اپنی پرانی زمینوں سے پہلے ہی تنگ آ چکے تھے، اب انہوں نے سندھ اور پنجاب

کی نو آبادیوں میں زرخیز زمین حاصل کرلی ہے یا اپنا سرمایہ شہری جائیدادوں میں لگالیا ہے۔

6- کئی مالکان اراضی ہیں جو خود یا جن کے رشتہ دار حاکم یا سرکاری افسر یا فوجی ہیں۔ ان کو ایوب حکومت نے مزید زمین "انعام" کے طور پر دے دی ہے۔

7- حصول اراضی کے بعد زرعی پیداوار اور زمین دونوں کی قیمت بہت بڑھ گئی' اس لیے زمینداروں نے حکومت سے خسارے کا سودا نہیں کیا بلکہ وہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ امیر اور خوشحال ہو گئے ہیں۔

8- بظاہر ضبط شدہ زمین مزارعوں میں بانٹی گئی ہے لیکن اندر خانہ چونکہ مالکوں نے اپنے مزارعوں سے سمجھوتہ کر رکھا ہے' اس لیے صورت حال میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

زرعی اصلاحات کے بعد مالکان اراضی کے پاس کتنی زمین رہ گئی ہے؟ اس کا کھوج لگانا آسان نہیں کیونکہ کوئی زمیندار یا اس کا کارندہ اپنا راز بتانے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ تاہم راقم الحروف نے پنجاب' سندھ اور سرحد کے تقریباً تمام صوبوں سے نمونہ کے طور پر اعداد و شمار فراہم کیے ہیں تاکہ موجودہ برسراقتدار حکومت کی رہنمائی ہو سکے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نہ صرف چھوٹے بڑے زمیندار کی ملکیت کا جائزہ لیا جائے بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ اس کے پاس یہ زمین کہاں سے آئی؟ اگر یہ زمین غداری کے صلہ میں ملی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مالک اراضی خود ہی انگریزی دور کے خطابات کی طرح اسے رضاکارانہ حکومت کے حوالے نہ کردے ورنہ اس بات کا جواز خود بخود پیدا ہو جائے گا کہ عوامی حکومت اسے بلا معاوضہ چھین لے۔ میں نے اعداد و شمار میں "کسر" درج نہیں کی بلکہ پورا عدد بنا دیا ہے۔ کچھ زمین بیکار پڑی رہتی ہے یا متفرق مصرف میں ہوتی ہے' اس لیے وہ حساب میں نہیں آئی۔ یہی وجہ ہے کہ کُل میں سے عطیہ اور ضبطی کا رقبہ خارج کر دیا جائے تو حاصل وہی نہیں جو میں نے بتایا ہے۔

میاں افتخار الدین: لاہور ڈویژن میں زرعی اصلاحات سے پہلے میاں افتخار الدین مرحوم کے نام دو ہزار ایک سو پندرہ ایکڑ زمین تھی جس میں سے 153-ایکڑ بطور عطیہ دے دیے گئے۔ 1283-ایکڑ ضبط کر لیے گئے اور اب ان کے نام اندازاً 529-ایکڑ رہ گئے ہیں۔ یہ رقبہ عام طور پر بیگم باغ کے نام سے مشہور ہے جو واگزار ہو چکا ہے۔

چوہدری محمد زبیر سندیلہ: ان کے پاس شیخوپورہ میں 893-ایکڑ تھے جن میں سے 369-ایکڑ ضبط کیے جا چکے ہیں اور باقی تقریباً 530-ایکڑ ان کے پاس ہیں۔

سلیمان سکندر: گوجرانوالہ میں ان کے پاس 1719-ایکڑ تھے جن میں سے 899-ایکڑ عطیہ کے طور پر گئے۔ 320-ایکڑ ضبط کر لیے گئے۔ پانچ سو ایکڑ باقی ہیں۔

لیفٹیننٹ کرنل کونول: ضلع میں 1722-ایکڑ کے مالک لیفٹیننٹ کرنل کونول تھے جو خود انگلستان میں رہتے ہیں۔ ان کی زمین پر مہاجر خاندانوں کا قبضہ ہے۔ 1089-ایکڑ بحق سرکار ضبط کی جا چکی ہے' باقی 633-ایکڑ

موجود ہے۔ سنا ہے کہ حکومت نے کونول صاحب کو بارہ ہزار روپیہ الاؤنس دینے کا اقرار کیا تھا۔

مشتاق احمد گورمانی: مظفر گڑھ میں گورمانی صاحب 4800-ایکڑ زمین کے مالک تھے۔ اس میں سے 180-ایکڑ حکومت کے حوالے کر دیے گئے۔ 3589-ایکڑ موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جو علاقہ ضبط ہوا وہ غیر آباد تھا لیکن اسے نہری لکھوا دیا گیا ہے۔

عطا محمد: ان کے پاس 4200-ایکڑ تھے۔ 1886-ایکڑ حکومت نے لے لیے' باقی 2315-ایکڑ ان کے پاس ہیں۔

علمدار شاہ: ملتان ڈویژن میں علمدار شاہ کے پاس 4833-ایکڑ زمین تھی جس میں سے 4278-ایکڑ حکومت نے لے لی۔ اب 555-ایکڑ کے وہ مالک ہیں۔

دیوان غلام عباس: دیوان صاحب 3464-ایکڑ زمین کے مالک تھے۔ پندرہ سو ایکڑ عطیہ کے طور پر دے دی گئی۔ 1310-ایکڑ پر حکومت نے قبضہ کر لیا۔ اب 554-ایکڑ رہ گئے ہیں۔

غلام نقشبند خان: ملتان ڈویژن میں غلام نقشبند خان کے پاس 3105-ایکڑ زمین تھی جس میں سے آٹھ سو ایکڑ عطیہ کے گئے۔ 1105-ایکڑ حکومت کے حوالے کر دیے گئے۔ اب بارہ سو ایکڑ ان کے پاس ہے۔

میجر حمید علی خاں ولد میجر سردار خاں نون کا رقبہ 828-ایکڑ تھا جس میں 60-ایکڑ عطیہ کے اور 187-ایکڑ ضبط کیے گئے۔ اب 642-ایکڑ ان کے پاس ہیں۔

میاں نذیر حسین رانجھا: سرگودھا میں ان کے پاس 1385-ایکڑ تھے جس میں سے 366-ایکڑ عطیہ اور 276-ایکڑ ضبطی کے ہوئے' باقی 642-ایکڑ رہ گئے۔

غضنفر عباس شاہ: جھنگ میں ان کا رقبہ 2697-ایکڑ تھا۔ 1788-ایکڑ حکومت کے حوالے کر دیے' 909-ایکڑ موجود ہیں۔

علی حسن شاہ: مجموعی رقبہ 1978-ایکڑ تھا۔ 252-ایکڑ عطیہ کے طور پر دیے گئے۔ 878-ایکڑ ضبط ہو گئے۔ 848-ایکڑ موجود ہیں۔

کرنل عابد حسین شاہ (مرحوم): ان کے پاس 3048-ایکڑ تھے۔ 447-ایکڑ عطیہ کے ہیں۔ 1210-ایکڑ گھوڑی پال کے طور پر دیے۔ 642-ایکڑ حکومت نے لے لیے' 749-ایکڑ ان کے پاس ہیں۔

اللہ داد لالی: کل رقبہ 1182-ایکڑ۔ عطیہ 260-ایکڑ۔ ضبط 256-ایکڑ۔ باقی 666-ایکڑ۔

راجہ افضال مہدی مرحوم: جہلم میں ان کے پاس 3285-ایکڑ تھے۔ 1522-ایکڑ حکومت نے لے لیے' 1763-ایکڑ موجود ہیں۔

سردار حمید اکبر خان ولد محمد اکبر خان: کیمبل پور میں ان کی زمین کا رقبہ 4180-ایکڑ تھا جس میں سے 591-ایکڑ عطیہ کے طور پر دیے گئے۔ 2049-ایکڑ حکومت نے رکھوا لیے' 1539-ایکڑ رہ گئے ہیں۔

سردار محمد نواز خان: مجموعی رقبہ 9583-ایکڑ۔8188ضبط۔اپنے پاس 1395-ایکڑ۔

نواب قطب الدین ٹونک: نواب ٹونک کے پاس بیس ہزار ایکڑ زمین تھی جس میں سے 7451-ایکڑ حکومت نے لے لی۔814-ایکڑ عطیہ کے طور پر دے دیے گئے۔غالباً سب سے زیادہ متاثر نواب صاحب ہوئے کیونکہ ڈیم کی تعمیر کے باعث ان کو پانی بھی میسر نہیں آتا رہا اور اب تمام زمین پر غیروں کا قبضہ ہے۔

عبدالغفور: ڈیرہ اسماعیل خان ڈویژن میں ان کے پاس پانچ ہزار ایکڑ زمین تھی جس میں سے 2700-ایکڑ حکومت نے ضبط کر لیے۔628-ایکڑ عطیہ دے دیے اور اب 1750-ایکڑ ان کے پاس ہے۔

عبدالستار خان: ان کے پاس ڈیرہ اسماعیل خان میں 2632-ایکڑ تھے جن میں سے 624-ایکڑ ضبط ہو گئے' تاہم 2368-ایکڑ موجود ہیں۔

نواب تنگی: پشاور ڈویژن میں ان کے پاس 1442-ایکڑ تھے جن میں سے 668-ایکڑ باقی رہ گئے ہیں کیونکہ 328-ایکڑ عطیہ کے نکل گئے اور 442-ایکڑ حکومت کو دے دیے۔

راجہ عزیز احمد خان: ہری پور ہزارہ میں ان کے پاس 3290-ایکڑ تھے جن میں سے 739-ایکڑ تحفہ کے نکل گئے' 561-ایکڑ حکومت نے لے لیے' اب 1920-ایکڑ رہ گئے ہیں۔

راجہ رکن زمان: ان کے پاس 31 مواضع میں پھیلی ہوئی 5916-ایکڑ زمین تھی جس میں سے 1225-ایکڑ بطور عطیہ دے دیے گئے' 2995-ایکڑ حکومت نے لے لیے' اب 1696-ایکڑ باقی ہیں۔

عزیز الرحمان خان: مجموعی رقبہ 1420-ایکڑ۔عطیہ 926-ایکڑ۔ضبط 543-ایکڑ۔اپنے پاس 581-ایکڑ۔

نواب باز محمد خان: مجموعی رقبہ 32406-ایکڑ۔ضبط 29236-ایکڑ۔باقی 3169-ایکڑ۔

عبدالستار شاہ: میانوالی کے عبدالستار شاہ کے پاس 7073-ایکڑ تھے جن میں سے 5570-ایکڑ ضبط کر لیے گئے۔1504-ایکڑ باقی ہیں۔

کیپٹن عبدالرحمان: میانوالی میں ان کے پاس 5597-ایکڑ زمین تھی۔1261-ایکڑ عطیہ کے طور پر دے 3300-ایکڑ بحق سرکار ضبط ہو گئے۔1033-ایکڑ اب بھی موجود ہیں۔

سلطان صلاح الدین خان: تحصیل عیسیٰ خیل میں ان کے پاس 5006-ایکڑ تھے۔1262-ایکڑ عطیہ کے طور پر گئے۔1724-ایکڑ حکومت نے لے لیے۔2019 موجود ہیں۔

لیفٹیننٹ کرنل محمد اسلم خان: مجموعی رقبہ 4555-ایکڑ۔2834ضبط۔1721موجود۔

عفیفہ بیگم دختر سردار جمال خاں لغاری: ماڈل ٹاؤن لاہور میں رہتی ہیں۔ڈیرہ غازی خان میں 8754-ایکڑ زمین تھی۔6086-ایکڑ حکومت نے لے لی۔668-ایکڑ موجود ہیں۔

سردار ذوالفقار علی خان: کل رقبہ 7970-ایکڑ۔عطیہ 639-ایکڑ۔ضبط 5268-ایکڑ۔موجود 1063-

حق نواز گشکوری: کل رقبہ 3025-ایکڑ۔عطیہ 713-ایکڑ۔ضبط 91-ایکڑ۔موجود 2221-ایکڑ۔

سردار محمد خان لغاری: کل رقبہ 18583-ایکڑ۔16772-ایکڑ ضبط۔باقی 1811-ایکڑ۔

سردار تاج محمد خان: کل رقبہ 4113-ایکڑ۔عطیہ 1278-ایکڑ۔ضبط 1272-ایکڑ۔باقی 1751-ایکڑ۔

میجر شمس الدین ولد مولوی غلام حسین خان: رئیس بہاولپور کے پاس 2060-ایکڑ تھے۔638 عطیہ کے طور پر گئے۔تیس ایکڑ میں باغات ہیں۔328-ایکڑ حکومت نے لے لیے۔باقی 1184-ایکڑ۔

سید رفیق محمد شاہ (بہاولنگر): کل رقبہ 3939-ایکڑ۔عطیہ 536-ایکڑ۔ضبط 2068-ایکڑ۔بقایا 1535-ایکڑ۔

غازی محمد خان: رحیم یار خان میں ان کے پاس 5052-ایکڑ تھے۔3978-ایکڑ حکومت نے لے لیے۔ 1074-ایکڑ پر قابض ہیں۔

وزیر احمد: یہ بھی رحیم یار خان کے زمیندار ہیں۔2431-ایکڑ زمین میں سے 759-ایکڑ عطیہ کے گئے۔ 795-ایکڑ پر حکومت نے قبضہ کر لیا۔877-ایکڑ رہ گئے ہیں۔

غازی احمد خان: کل رقبہ 5135-ایکڑ۔4061ضبط۔1074موجود۔

سید اقبال محمود: کل رقبہ 1660-ایکڑ۔392-ایکڑ عطیہ۔781-ایکڑ ضبط۔487-ایکڑ موجود۔

صوبہ سندھ

اب سندھ کے چند مالکان اراضی ملاحظہ فرمائیے:

محمد خان: مجموعی رقبہ 1842-ایکڑ۔عطیہ 449-ایکڑ۔ضبط 494-ایکڑ۔موجود 898-ایکڑ۔

فضل علی شاہ: مجموعی رقبہ 3852-ایکڑ۔عطیہ 600-ایکڑ۔ضبط 1457-ایکڑ۔موجود 1795-ایکڑ۔

آر۔ایس۔روپ چند: مجموعی رقبہ 11513-ایکڑ۔عطیہ 1403-ایکڑ۔ضبط 1251-ایکڑ۔موجود 859-

محمد حسین شاہ: مجموعی رقبہ 1405-ایکڑ۔عطیہ 346-ایکڑ۔ضبط 117-ایکڑ۔موجود 872-ایکڑ۔

محمد صالح: مجموعی رقبہ 1949-ایکڑ۔عطیہ 467-ایکڑ۔ضبط 873-ایکڑ۔موجود 609-ایکڑ۔

خوب چند (سانگھڑ): مجموعی رقبہ 1353-ایکڑ۔ضبط 431-ایکڑ۔باقی 923-ایکڑ۔

حاجی انور علی خان: کل رقبہ 3288-ایکڑ۔عطیہ 529-ایکڑ۔ضبط 1700-ایکڑ۔موجود 1059-ایکڑ۔

غلام حیدر خان: کل رقبہ 1218-ایکڑ۔ضبط 204-ایکڑ۔باقی 1014-ایکڑ۔

جان محمد وسان: کل رقبہ 3186-ایکڑ۔عطیہ 468-ایکڑ۔ضبط 1609-ایکڑ۔موجود 1049-ایکڑ۔

غلام محمد: کل رقبہ 3278-ایکڑ۔ضبط 2178-ایکڑ۔موجود 1087-ایکڑ۔

پیر غلام رسول و پیر عبدالستار (فیملی): مجموعی رقبہ 2610-ایکڑ۔عطیہ 487-ایکڑ۔ضبط 976-ایکڑ۔باقی

926-ایکڑ۔

چیت رام: مجموعی رقبہ 3588-ایکڑ۔ عطیہ 486-ایکڑ۔ ضبط 2147-ایکڑ۔ باقی 955-ایکڑ۔

میر حاجی غلام محمد: کل رقبہ 8325-ایکڑ۔ عطیہ 48-ایکڑ۔ ضبط 6897-ایکڑ۔ باقی 947-ایکڑ۔

ہری چند رائے: کل رقبہ 5138-ایکڑ۔ عطیہ 480-ایکڑ۔ ضبط 3685-ایکڑ۔ موجود 973-ایکڑ۔

نواب میر اللہ داد خان (تالپور): کل رقبہ 2946-ایکڑ۔ عطیہ 461-ایکڑ۔ ضبط 1554-ایکڑ۔ باقی 931-ایکڑ۔

ملک شاندار خان: کل رقبہ 20651-ایکڑ۔ عطیہ 1402-ایکڑ۔ ضبط 15069-ایکڑ۔ موجود 4180-ایکڑ۔

سیٹھ بندومل: کل رقبہ 2352-ایکڑ۔ عطیہ 632-ایکڑ۔ ضبط 520-ایکڑ۔ موجود 1200-ایکڑ۔

سلطانہ بیگم: کل رقبہ 771-ایکڑ۔ ضبط 312-ایکڑ۔ موجود 459-ایکڑ۔

سردار محمد حسن سومرو: کل رقبہ 3140-ایکڑ۔ عطیہ 616-ایکڑ۔ ضبط 166-ایکڑ۔ باقی 2459-ایکڑ۔

خان بہادر فضل محمد خان لغاری (ٹھٹھہ): کل رقبہ 2949-ایکڑ۔ عطیہ 1056-ایکڑ۔ ضبط 443-ایکڑ۔ پاس 1450-ایکڑ۔

ہزہائی نس میر مراد خاں تالپور: مجموعی رقبہ 10200-ایکڑ۔ عطیہ 309-ایکڑ۔ ضبط 8999-ایکڑ۔ پاس 900-ایکڑ بشمول 149-ایکڑ (باغات)۔

سید حسن بخش شاہ: کل رقبہ 1595-ایکڑ۔ عطیہ 392-ایکڑ۔ ضبط 513-ایکڑ۔ پاس 690-ایکڑ۔

رسول بخش (اور فیملی): کل رقبہ 2322-ایکڑ۔ عطیہ 64-ایکڑ۔ ضبط 1249-ایکڑ۔ پاس 1009-ایکڑ۔

سردار نور محمد خان (باجہ رانی فیملی): کل رقبہ 6395-ایکڑ۔ ضبط 5195-ایکڑ۔ موجود 1200-ایکڑ۔

خادم حسین شاہ (سکھر): کل رقبہ 36789--ایکڑ۔ ضبط 33486-ایکڑ۔ موجود 1303-ایکڑ۔

شیخ محمد نواز (لاڑکانہ): کل رقبہ 2087-ایکڑ۔ عطیہ 527-ایکڑ۔ ضبط 498-ایکڑ۔ موجود 1059-ایکڑ۔

عنایت اللہ خان (اسو فیملی): کل رقبہ 1454-ایکڑ۔ ضبط 395-ایکڑ۔ موجود 1059-ایکڑ۔

میر گدا علی خان (بھائیو فیملی): مجموعی رقبہ 3162-ایکڑ۔ عطیہ 701-ایکڑ۔ ضبط 1403-ایکڑ۔ باقی 1058-ایکڑ۔

عبدالقادر (کھوسو فیملی): مجموعی رقبہ 2732-ایکڑ۔ عطیہ 707-ایکڑ۔ ضبط 770-ایکڑ۔ باقی 1257-ایکڑ۔

چلہ رام: مجموعی رقبہ 4100-ایکڑ۔ عطیہ 785-ایکڑ۔ ضبط 1683-ایکڑ۔ باقی 1632-ایکڑ۔

باب 5

غائب باش - نئے اور پرانے

میاں ممتاز دولتانہ اور ایوب خان کی زرعی اصلاحات کا مقصد یہ بیان کیا گیا تھا کہ بڑی زمینداریوں کو ختم کر کے ملکیت چھوٹے کاشتکاروں اور مزارعین کے حوالے کر دی جائے گی۔ لیکن عملی طور پر یہ اصلاحات بڑی زمینداریوں کے تحفظ کا ایک مضبوط ذریعہ بن گئیں اور کاشتکاروں کے حصے بہت کم رقبہ آیا۔ زرعی اصلاحات کی جو تفصیلات مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی کے بجٹ سیشن 1968ء میں پیش کی گئیں' ان سے ظاہر ہے کہ ان اصلاحات کے تحت 22 لاکھ 9 ہزار 464-ایکڑ رقبہ بڑے زمینداروں سے قیمت ادا کر کے حاصل کیا گیا۔ اس میں سے صرف 37,274-ایکڑ مزارعین اور کاشتکاروں کو دیا گیا' باقی 5 لاکھ 35 ہزار 606-ایکڑ کھلے بازار میں فروخت کر دیے گئے۔ ایک لاکھ 84 ہزار 324-ایکڑ نیلام کیے گئے۔ 2 لاکھ 35 ہزار 214-ایکڑ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسے بہتر بنایا جا رہا ہے۔ 3 لاکھ 35 ہزار 758-ایکڑ زرعی محکمہ کی تحویل میں دے دیے گئے۔ تاہم اب بھی 8 لاکھ 61 ہزار 213-ایکڑ ایسے موجود ہیں جن کے متعلق تاحال کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔

ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ زرعی اصلاحات کے تحت جو رقبہ زمینداروں سے قیمتاً خریدا گیا تھا' وہ پھر بڑے بڑے زمینداروں اور سرکاری افسروں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ سابق وزیر زراعت ملک خدا بخش بچہ نے 15 فروری 1969ء کو صوبائی اسمبلی میں ان لوگوں کے ناموں کا انکشاف بھی کیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ کم سے کم دو لاکھ ایکڑ رقبہ ایسا ہے جو 66 افراد کو بلا کرایہ پٹہ پر دے دیا گیا ہے۔ ان کی فہرست درج ذیل ہے:

1- سلطان احمد چانڈیو	1,23,381-ایکڑ
2- امیر بہاول پور	20,000 "
3- ملک امیر محمد خان آف میانوالی اور ان کے چار صاحبزادے	18,619 "
4- ملک خضر حیات خان ٹوانہ	5,700 "
5- میر صاحب خیرپور	5,239 "
6- حاجی غلام رسول جتوئی مرحوم	3,787 "
7- ایس غلام محمد خان مہیسر اور ایس علی گوہر خان	4,061 "
8- نواب سر محمد فرید	1,818 "

9- ایس گل حسن شاہ لواری شریف	3,124	"
10- کرنل سید عابد حسین	1,075	"
11- ایس غلام محمد شاہ اور ایس طاہر علی شاہ	1,075	"
12- پیر صاحب رانی پور	364	"
13- ذوالفقار علی بھٹو	178	"
14- میاں جمال شاہ	500	"
15- میاں غلام محمد فنگیانہ	74	"
16- نواب محمد مہر شاہ	936	"
17- کرنل محمد علی نون	1,482	"
18- میاں محمد سعید قریشی	1500	"
19- کرنل جے-وی-سی کننگھم	2,948	"
20- مینجر آرمی سٹڈ فارم	12,519	"
21- جے-وائی-ایل-ٹیلر	7,723	"
22- محمد امین خان	500	"
23- غلام جیلانی خان	500	"
24- سید محمد الدین لال بادشاہ	100	"
25- بریگیڈیئر ملک گل شیر خان نون	3,171	"
26- غلام محی الدین	500	"
27- میجر جنرل جمالدار	527	"
28- ملک فضل الٰہی ٹوانہ	429	"
29- لیفٹیننٹ کرنل محمد عطاءاللہ سنبل	250	"
30- خان بہادر سردار دوست محمد خان	4,190	"
31- چوہدری ظفراللہ خان	4,056	"
32- سید محمد عباس شیرگڑھی	224	"
33- نواب میجر سر محمد فرید خان	121	"
34- سردار محمد نواز خان	14	"

35- چوہدری اصغر علی خاں	29	"
36- نواب سجاد علی خان	23	"
37- ملک خضر حیات خان ٹوانہ	24	"
38- ملک شیر احمد خان	69	"
39- چوہدری خدا بخش	33	"
40- ملک فیروز خان نون	121	"
41- ملک خضر حیات خان ٹوانہ	135	"
42- ملک حبیب اللہ خان	12	"
43- مسٹر وزیر آغا	88	"
44- مہر غلام دستگیر	13	"
45- میاں خان محمد	54	"
46- سعید محمد شاہ	11	"
47- محمد حیات خان	27	"
48- نوازش علی خان	25	"
49- مسمات خورشید بیگم عرف نسیم بی بی	19	"
50- سردار غلام محمد	12	"
51- سید محمد وارث	11	"
52- سید مبارک علی شاہ	82	"
53- ملک محمد نواز خان	10	"
54- نوابزادہ ملک امیر محمد خان آف کالاباغ	120	"
55- میاں خدا یار خان	76	"
56- میر بخش شیر خان	36	"
57- سردار شیر جان خان	36	"
58- سردار شیر باز خان	36	"
59- صوفی عطا محمد	28	"
60- ایس محمد نواز شاہ	23	"

61- پیر معراج الدین	47	"
62- ایس محمد نصیر الدین	27	"
63- ایس محمد نذر حسین شاہ	84	"
64- خواجہ محمود خان	137	"
65- دیوان ایس غلام عباس شاہ	40	"
66- ایم ممتاز محمد خان دولتانہ	28	"
67- ایم مشتاق محمد خان	61	"
68- میجر شمس الدین	30	"
69- میاں غیاث الدین	66	"
70- ہزہائی نس میر علی مراد خان تالپور	46	"
71- نثار احمد	22	"
72- میر اللہ بخش بچائیو	35	"
73- شریمتی بھگوتی	62	"
74- سر راجیر ٹومو	37	"
75- حاجی علی حسن ماڑی	54	"
76- اخوند حاجی عبد اللطیف	13	"
77- آر-ایس-روپ چند سیوہل	15	"
78- حاجی محمد صالح ناہیون	19	"
79- میر غلام	12	"
80- سید محمد حسن	110	"
81- حاجی دریا خان	19	"
82- حاجی قلندر بخش	14	"
83- مسماۃ بادشاہ زادی	65	"

نوٹ: ان میں سے بعض لوگوں کو دو دو تین تین مختلف مقامات پر زمین دی گئی ہے' اس لیے ان کے نام بھی دو دو تین تین مرتبہ آتے ہیں۔ اصل تعداد 66 ہی ہے۔

ملک خدا بخش بچہ (سابق وزیر زراعت) کے بقول یہ زمین ان حضرات کو زرعی اصلاحات کے قانون 9 (ڈی) کے تحت بھیڑ بکریاں پالنے' گھوڑے رکھنے' باغات اور شکار گاہیں بنانے کے لیے عطا کی گئی۔ جب ایک رکن اسمبلی مسٹر حمزہ نے پوچھا کہ آیا ان لوگوں سے پٹہ کی رقم وصول کی جائے گی تو وزیر موصوف نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر مسٹر حمزہ نے پوچھا کہ امیر بہاولپور کو بیس ہزار ایکڑ کس خوشی میں دیے گئے؟ وزیر موصوف نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا "یہ صحرائی علاقہ ہے جیسے چولستان"۔ مسٹر حمزہ نے دریافت کیا "ملک خضر حیات ٹوانہ اور مسٹر سلطان احمد چانڈیو کو اتنی زمین کیوں دی گئی؟" وزیر نے جواب دیا "بھیڑ بکریاں پالنے اور مویشی فارم قائم کرنے کے لیے"۔

واقعہ یہ ہے کہ بڑے زمینداروں کو مویشی پال فارم کھولنے اور باغات لگانے کے لیے کھلی اور باموقع زمین ہی نہیں دی گئی' بیراجوں کی زرخیز زمین بھی کوڑیوں کے بھاؤ دے دی گئی ہے۔

چنانچہ غلام محمد بیراج کی 28 لاکھ 6 ہزار 210- ایکڑ زمین سے صرف 3 لاکھ 78 ہزار 662- ایکڑ ہاریوں اور چھوٹے کاشتکاروں کے حصے آئے' باقی سب فوجیوں اور سرکاری افسروں میں بانٹ دی گئی ہے۔ اسی طرح گدو بیراج کے 37 لاکھ 53 ہزار 1700- ایکڑ رقبہ میں سے ہاریوں اور چھوٹے کاشتکاروں کو 95 ہزار 867- ایکڑ سے زیادہ نہیں مل سکے۔

ایک اندازہ کے مطابق بیراجوں کے ذریعہ سے کم و بیش 81 لاکھ ایکڑ "نہری رقبہ" میں تبدیل ہوئے ہیں۔ ان میں سے صرف چار لاکھ چوہتر ہزار ایکڑ چھوٹے کاشتکاروں اور مزارعوں کو دیے گئے ہیں۔ (صوبائی اسمبلی بجٹ سیشن 1967ء)۔

جن سرکاری افسروں کو یہ زرخیز اور نہری رقبہ دے کر "دیہہ خداؤں" میں "تازہ خداؤں" کا اضافہ کیا گیا ہے' ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

سابق وزیر اور گورنر

1- ملک خدا بخش بچہ وزیر زراعت	158-	ایکڑ
2- خان غلام سرور خان وزیر مال	240	"
3- خان حبیب اللہ خاں وزیر داخلہ	240	"
4- مسٹر این ایم عقیلی وزیر خزانہ	249	"
5- بیگم این ایم عقیلی	351	"
6- مسٹر اختر حسین گورنر مغربی پاکستان	150	"

جج سپریم وہائی کورٹ

1- جسٹس محمد منیر	150-ایکڑ
2- جسٹس ایس اے رحمان	150 "
3- جسٹس عبدالعزیز	150 "
4- جسٹس انعام اللہ خاں	240 "
5- جسٹس محمد داؤد خاں	240 "
6- جسٹس فیض اللہ خاں	240 "

سرکاری افسر

1- ایم ایم احمد-اکونامک ایڈوائزر	150-ایکڑ
2- سید حسن-ڈپٹی چیئرمین پلاننگ	150 "
3- ملک عطا محمد نون-ڈی-آئی-جی-پولیس	150 "
4- جنرل کے-ایم-شیخ	150 "
5- مسٹر نوراللہ-ریلوے انجینئر	150 "
6- این-اے-قریشی-چیئرمین ریلوے روڈ	150 "
7- امیر محمد خان-سیکرٹری محکمہ صحت	238 "
8- ایس-ایم-شریف-سیکرٹری تعلیم	239 "
9- خان نجف خاں-ڈی-آئی-جی-پولیس	240 "
10- میجر جنرل اکبر خاں	240 "
11- بریگیڈیئر ایف-آر-کلو(ڈپٹی ڈائریکٹر خوراک)	240 "
12- عبدالرشید خاں-کمشنر	240 "
13- مسٹر محمد علی-وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی	100 "
14- ایم-ڈبلیو-عباسی-چیف سیکرٹری	247 "

ان ناموں کا انکشاف بھی صوبائی اسمبلی کے اجلاس مورخہ 13جون 1967ء میں کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ لاہور کے سرحدی علاقوں میں ریٹائرڈ فوجیوں کو وسیع قطعاتِ اراضی (دس سے ساٹھ مربع تک) الاٹ کر دیے گئے تھے جن کی اصلاح اور درستی کے لیے سرکاری خزانہ سے بے دریغ روپیہ خرچ کیا گیا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ زرعی اصلاحات نے ملک میں دو طبقے پیدا کر دیے ہیں۔ ایک طبقہ بڑے بڑے عہدوں پر قابض ہونے کے باعث با اختیار ہے۔ اس لیے جب بھی آبپاشی کا انتظام ہوتا ہے تو بڑے بڑے قطعات پر قبضہ جما لیتا ہے۔ دوسرا طبقہ چھوٹے کاشتکاروں اور بے زمین مزارعین کا ہے جو اپنے آپ کو بڑے زمینداروں اور حکومت کے افسروں کے سامنے بے بس پاتا ہے۔ بیراج کی زمین پر سب سے زیادہ سرمایہ غریب کسانوں کا لگا ہے' اس کے باوجود اراضی کی غلط منصوبہ بندی کے باعث یہ زمین غلہ پیدا کرنے کی بجائے شور اگل رہی ہے۔ چنانچہ راقم الحروف کے اندازے کے مطابق صرف غلام محمد بیراج کی ترقی پر زرعی ترقیاتی کارپوریشن 85 کروڑ روپے سے بھی زائد رقم خرچ کر چکی ہے۔ اس کے باوجود لاکھوں ایکڑ زمین میں سے صرف چند ہزار ایکڑ اراضی پر کاشت کی جا رہی ہے' جس سے اتنا غلہ بھی پیدا نہیں ہوتا جو وہاں کی آبادی کی غذائی ضروریات پوری کر سکے۔ پھر محنت و مشقت تو کاشتکار کرتے ہیں لیکن فصل آ کر غائب مالکانِ اراضی اور سرکاری افسر اٹھا کر لے جاتے ہیں جن کو یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ فصلِ ربیع اور فصلِ خریف میں کیا فرق ہوتا ہے۔

باب 6

شاہ پور کے ٹوانے

سابقہ ابواب سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ پاکستان کے دیہہ خداؤں کو چار طائفوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1- خاندانی جاگیردار' وڈیرے اور زمیندار جن کے پاس اب بھی باغوں' شکار گاہوں اور مویشی پال فارموں کے علاوہ وسیع قطعاتِ اراضی موجود ہیں۔

2- سرکاری افسر' جج اور فوجی جن کو 1958ء کے بعد ملک کی منتخب اور زرخیز ترین زمین عطا کی گئی۔

3- سمگلر جنہوں نے اپنی ناجائز دولت پر پردہ ڈالنے کے لیے زمین خرید لی۔

4- 22 خانوادوں کے افراد جنہوں نے صنعتی اور تجارتی اجارہ داری قائم کرنے کے علاوہ کاشتکاری سے بھی اپنے مفاد وابستہ کر لیے۔

ان میں سے پہلا طائفہ بڑا سخت جان ہے۔ وہ چونکہ یا تو خود برسرِ اقتدار ہوتا ہے یا حکومت وقت کا سب سے بڑا مؤید اور مددگار کہلاتا ہے' اس لیے کوئی بھی حکومت اسے ختم نہیں کر سکی۔ اس طائفہ میں دو قسم کے افراد شامل ہیں' ایک وہ جن کے آباؤ اجداد نے غداری کی اور 1857ء کے انقلاب میں انگریز کو اس ملک میں اپنے پاؤں جمانے کے لیے بڑھ چڑھ کر امداد بہم پہنچائی۔ دوسرے وہ جنہوں نے مغلیہ دور کے خاتمہ پر طوائف الملوکی اور سیاسی بے چینی سے فائدہ اٹھایا اور بڑے بڑے قطعاتِ اراضی پر قابض ہو کر انگریز سے اپنے حقوق ملکیت منوا لیے۔ اس میں شبہ نہیں کہ دونوں طائفوں کی اولاد نے پہلے برصغیر اور بعد میں پاکستان کے مسلمانوں کی بڑی خدمت کی ہے اور اسے قوم فروش یا غدار کہنا کسی طرح بھی درست نہیں۔ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان کی اراضی پر اس طائفہ کے بیشتر افراد (جیسا کہ مسلم لیگ زرعی کمیٹی نے 1948ء میں لکھا تھا) اپنا حقِ ملکیت 1857ء سے پہلے ثابت نہیں کر سکتے۔ بایں ہمہ یہ خیال رہے کہ جن افراد کو جارج پنجم کے شاہی دربار دہلی میں کرسی ملی یا جن کو انعام و اکرام اور جاگیروں اور خطابوں سے سرفراز کیا گیا' ان میں سے اکثر کی اولاد کو پاکستان میں کچھ بھی نہیں مل سکا کیونکہ "جاگیروں" اور "معافیوں" پر تو مسلم لیگی وزارتوں نے پہلے ہی خط تنسیخ کھینچ دیا تھا اور متروکہ اراضی بھی سب کو الاٹ نہیں ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی دور کے جو نواب اور خطاب یافتہ افراد لٹ پٹ کر پاکستان میں آئے' ان کی حقیقت عام شہریوں سے بہتر نہیں اور ان میں سے بعض کرایہ کے مکانوں میں رہتے اور معمولی ملازمتوں سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔

پاکستان کے دیہہ خداؤں کا سب سے بڑا جھرمٹ غالباً شاہ پور (سرگودھا ڈویژن) میں ہے۔ یہاں مٹھا ٹوانہ کا ایک علاقہ ہے جس میں ٹوانے' گھیبے' سیال' نون' اعوان' چھل اور کرار سب آباد ہیں۔ مٹھا ٹوانہ کی بنیاد 1680ء میں میر احمد خاں نے رکھی جو ایک ہندو راجپوت رائے شنکر کی اولاد میں سے تھا۔ یہ لوگ مسلمان ہونے کے بعد دریائے سندھ کے کنارے جہانگیر کے مقام پر آکر آباد ہو گئے تھے۔ قریب ہی ڈنڈا کے علاقہ میں ایک جگہ میٹھا پانی دریافت ہوا تو میر احمد خاں نے وہیں آکر ڈیرے ڈال دیے۔ رفتہ رفتہ یہ گاؤں بہت پھیل گیا اور اس میں کئی قبیلوں نے (جو دراصل ایک دوسرے کی شاخ ہیں) رہائش اختیار کر لی۔ مٹھا ٹوانہ کے شمال میں پانچ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہڈیالی ہے' وہاں اعوان قبیلہ رہتا تھا۔ میر احمد خاں نے اس کے بے شمار افراد کو موت کے گھاٹ اتار کر اردگرد کے علاقہ میں اپنی سرداری قائم کر لی' حتیٰ کہ اس کی اولاد میں سے ایک شخص شیر خاں "ملک" بھی کہلانے لگا۔ اس نے اپنے بھائی عالم شیر خان سے مل کر نہ صرف اپنے چچا کو قتل کیا' بلکہ ایک جھڑپ میں باپ کو بھی مار ڈالا۔ اس کے بعد اردگرد کی پہاڑیوں میں آباد اعوانوں کا "شکار" کھیل کر پورے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ کہتے ہیں کہ عالم شیر خاں اکثر صبح سویرے اپنی بندوق لے کر آس پاس کے ٹیلوں پر چڑھ جاتا اور جہاں کہیں کوئی اعوان نظر آتا' پہلے اس کا شکار کھیلتا پھر واپس آکر ناشتہ کرتا۔ جب شیر خاں نے طاقت پکڑ لی تو اس نے ڈیرہ اسماعیل خاں کے گورنروں کو خراج دینا بھی بند کر دیا۔

1745ء میں شیر خاں نے نور پور ٹوانہ کی بنیاد رکھی اور تھوڑے ہی عرصہ میں جھنگ کے سیالوں کو مار بھگایا۔ اس کی موت کے بعد اس کے دونوں بیٹے آپس میں اقتدار کی کشمکش میں مصروف رہے۔ اس کے علاوہ ہمسایوں سے بھی جنگ جاری رہی۔

1817ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے نور پور کے ٹوانوں پر چڑھائی کی اور اس علاقہ کو فتح کر کے جسونت سنگھ مؤکل کی فوجی نگرانی میں دے دیا۔ تاہم اس وقت کے ملک احمد یار خاں نے اپنا علاقہ پھر واپس لے لیا۔ لیکن اسے منکیرا کے نواب نے ٹکنے نہ دیا اور اس کے بیٹوں کو قید کر لیا۔ اس پر ملک احمد یار خاں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے پناہ طلب کی۔ اس نے اسے جھاوڑیاں کی جاگیر عطا کر دی اور ساٹھ سوار بھی دیے۔ 1821ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے منکیرا کے نواب پر فوج کشی کی' جس میں ملک ٹوانہ نے اس کی پوری مدد کی۔ مہاراجہ نے خوش ہو کر ٹوانوں کا ایک رسالہ اپنی فوج میں شامل کر لیا۔ اس رسالہ کے ٹوانہ سردار نے مہاراجہ کی بڑی خدمت کی' جس کے صلہ میں اسے نہ صرف جاگیر ملی بلکہ "چابک سوار" کا عہدہ بھی پایا۔ 1838ء میں راجہ دھیان سنگھ نے فتح خاں ٹوانہ کو نہ صرف مٹھا ٹوانہ کا معینجر مقرر کر دیا بلکہ وڑچہ اور چوآنام نمک کی کانیں بھی اس کے سپرد کر دیں۔ تاہم فتح ٹوانہ کا حقیقی عروج راجہ نونہال سنگھ کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ اس نے فتح خاں کے رشتہ داروں کو میاں والا' شیخوپال اور نور پور ٹوانہ کا "کاردار" مقرر کر دیا اور خود فتح خاں کو مختلف زمینداروں سے مالیہ وصول کرنے پر لگا دیا۔ تاہم وہ سکھ سرداروں کو آپس میں لڑانے کی سازشیں بھی کرتا رہا۔

اخیر اسے جان بچانے کے لیے دریائے سندھ کے پار بھاگنا پڑا۔ اس کی عدم موجودگی میں سکھوں نے مٹھاٹوانہ کو خوب خوب لوٹا۔ آخر جب جواہر سنگھ نے زور پکڑا تو فتح خاں واپس آیا اور اپنے سکھ محسن سے انعام و اکرام پانے کے علاوہ مٹھاٹوانہ کی گورنری بھی لے لی اور اس طرح جہلم، راولپنڈی، ڈیرہ غازی خاں اور بنوں وغیرہ کے علاقوں کا بہت سا حصہ اس کے زیر اقتدار آگیا۔ جواہر سنگھ نے اس کی قیمت یہ وصول کی کہ فتح خاں کو اپنے دشمن پشورا سنگھ کے پیچھے لگا دیا۔ پشورا سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا ایک بیٹا تھا اور اس نے مسلمان سرداروں کو ساتھ ملا کر قلعہ اٹک پر قبضہ کر رکھا تھا۔ فتح خاں نے نہ صرف قلعہ فتح کر لیا بلکہ پشورا سنگھ کو موت کے گھاٹ اتار کر اس کی لاش دریائے اٹک میں بہا دی۔ "چیفس آف دی پنجاب" کے مصنف نے لکھا ہے کہ تاریخِ پنجاب میں اس سے زیادہ دردناک قتل کوئی نہیں ہوا۔

فتح خاں ٹوانہ اسی مار دھاڑ میں مصروف تھا کہ انگریز پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خاں کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ 1848ء میں اسے بنوں کا گورنر بنا کر بھیج دیا گیا۔ یہاں اس نے قبائلی سرداروں کو ساتھ ملا کر سکھوں کا مقابلہ کرنا چاہا لیکن اسے قلعہ کے دروازے پر گولی مار دی گئی۔

گجرات میں سکھوں کو شکست دینے کے بعد جب پورا پنجاب انگریز کے قبضہ میں آیا تو اس نے ملک فتح خاں کی جاگیر اور زمینوں کو اس کے بیٹے اور بھتیجے میں تقسیم کر دیا۔ فتح خاں کا لڑکا فتح شیر خاں چونکہ میجر ایڈورڈس کی خدمت میں بھی رہا، اس لیے حکومت نے ٹوانوں کو جاگیروں اور معاوضوں سے مالا مال کر دیا۔ تاہم اس قبیلہ کے ملک فتح شیر خاں اور ملک شیر محمد خاں کی دشمنی بدستور قائم رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ خاندان کئی شاخوں میں بٹ کر رہ گیا۔

نوٹ ملک فتح شیر خاں نے انگریز کی سب سے نمایاں خدمات جنگ آزادی 1857ء کے سلسلہ میں سرانجام دیں۔ چنانچہ اسے نہ صرف خان بہادر کا خطاب دیا گیا بلکہ پنشن اور جاگیر بھی عطا ہوئی۔ نوٹ

ملک فتح شیر خاں کے بعد اس کے بیٹے محمد شیر خاں کو ایچی سن کالج لاہور میں تعلیم دی گئی۔ جنگ آزادی کے زمانہ میں ٹوانہ ملکوں نے نہ صرف تین سو سواروں کی ایک فوج انگریز کے حوالے کی بلکہ خود بھی کئی مہمات میں گورا فوج کے ساتھ مل کر حریت پسندوں کے خون سے ہولی کھیلتے رہے۔ اس کے عوض ان کو جو کچھ ملا اسی کی بدولت وہ پنجاب کے امیر ترین زمیندار بن گئے۔ ملک شیر محمد کو جاگیروں اور پنشنوں کے علاوہ تیس ہزار ایکڑ زمین خوشاب میں اور پندرہ سو ایکڑ زمین جہلم میں دی گئی۔ ملک شیر محمد خاں کے چچا ملک صاحب خان نے بھی جنگ آزادی میں تین سو گھوڑا سوار دیے اور کوپر کے زیر کمان جہلم، انبالہ اور کانپور کی مختلف لڑائیوں میں حریت پسندوں کا خون بہایا۔

ملک صاحب خان نے بھی انگریز سے خان بہادر اور سی۔ ایس۔ آئی کے خطابات اور پنشن کے علاوہ جاگیر اور وسیع قطعات اراضی پائے۔ اس کی زمین کی آبپاشی کے لیے دریائے جہلم سے خاص طور پر ایک نہر نکالی گئی۔

اس کا بیٹا عمر حیات خاں* تھا جو ملکی اور غیر ملکی مہمات میں انگریز جرنیلوں کا ہم سفر رہا اور پنجاب لیجسلیٹو کونسل کا ممبر بھی مقرر ہوا۔ اسے بھی سی۔ آئی۔ ای کا خطاب ملا۔

اسی طرح ملک صاحب خان کے بھائی ملک جہان خان نے بھی انگریز کی خدمات کا پورا معاوضہ وصول کیا۔ وہ ساٹھ سوار لے کر ایڈورڈس کی فوج میں شامل ہو گیا اور اس نے ملتان اور سی پی کی جنگوں میں انگریز کا پورا پورا ساتھ دیا۔ اسے بھی پنشن ملی اور اس کے بیٹے ملک محمد خان کو قیمتی زمین پٹہ پر دی گئی۔ ملک صاحب خان کے بھائی ملک فتح خان پر بھی انگریزی نوازشوں کی بارش ہوتی رہی۔ اس نے چھچھراں اور چنیوٹ کے علاوہ جنگ آزادی میں جہلم، اجنالہ اور فیروز شاہ میں حریت پسندوں پر ظلم ڈھائے۔ اس کے عوض اسے ڈیڑھ سو ایکڑ زمین معافی ملی۔ ملک فتح خاں کا بیٹا ملک مظفر خان تھا جو درباری ہونے کے علاوہ ایک ہزار ایکڑ کا مالک تھا۔

غرض مٹھاٹوانہ کا شاید ہی کوئی فرد ہو جس نے حریت پسندوں کی لاشوں پر اپنا قصرِ امارت تعمیر نہ کیا ہو۔

* اسی عمر حیات ٹوانہ کا بیٹا خضر حیات ٹوانہ متحدہ ہندوستان میں وزیر اعظم پنجاب بنایا گیا، جس نے اپنے انگریز آقاؤں کی خوشنودی کی خاطر تحریک قیام پاکستان کی راہ میں ہر طرح کی رکاوٹیں ڈالیں، لیکن منہ کی کھائی۔ (پبلشر)

باب

نُون

سرگودھا ڈویژن میں ٹوانہ، نون اور اعوان قبائل کے جو بڑے بڑے زمیندار آباد ہیں وہ سب کے سب "مِلک" کہلاتے ہیں۔ ان کے شجرۂ نسب سے ظاہر ہے کہ وہ ہندو راجپوتوں کی اولاد ہیں جو پندرہویں صدی میں دریائے سندھ کے کنارے آکر آباد ہو گئے تھے۔ ان لوگوں نے قرب و جوار کے علاقے میں مار دھاڑ کی اور بے شمار اراضی پر قبضہ کر لیا۔ اسی ملکیت کے باعث ان میں سے ایک ٹوانے ملک شیر خان نے اپنے آپ کو "ملک" کہلانا شروع کر دیا۔ انگریز کی آمد پر ان لوگوں کی قسمت کا ستارہ چمکا۔ انہوں نے 1857ء میں آزادی پسندوں کا خون بہایا جس کی سرخی نے ان کے چہرے گلنار کر دیے۔ ان کے سینوں پر سونے اور چاندی کے تمغے جگمگانے لگے اور ان کی جاگیریں حدِ نظر تک وسیع ہو گئیں۔ سر سکندر حیات خان، سر فیروز خان نون، سر خضر حیات خان سب اسی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔

تھل اور شاہ پور کو آباد کرنے میں بلوچستان کے ایک خاندان کا بھی حصہ ہے جس نے 1527ء میں اس علاقے پر قبضہ کیا۔ اس کا سربراہ ملک بحر خان کچھ، مکران کا ایک معمولی سردار تھا۔ اس کی ایک بیٹی کے حسن کے چرچے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ سیستان کے سردار نے رشتہ مانگا لیکن بحر خاں نے انکار کر دیا۔ اس پر سیستان کے سردار نے اسے تنگ کرنا شروع کر دیا جس سے عاجز آکر بحر خان دہلی چلا گیا۔ وہاں شہنشاہ بابر نے نیا نیا قبضہ کیا تھا۔ شہنشاہ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اسے فرخ آباد کی جاگیر بخش دی۔ اس کے علاوہ بحر خاں کو شاہ پور کے نواح میں علاقہ تھل کا رئیس بنا دیا۔ یہاں اسے اپنا انتقام لینے کا موقع ملا۔ اس نے اپنا صدر مقام خوشاب کو بنایا۔ اس کی وفات کے بعد گل بالک خان گدی پر بیٹھا، جس نے شاہ پور میں کئی نئے دیہات آباد کیے اور کھٹکیاں نام ایک قبیلہ کے تمام افراد کو موت کے گھاٹ اتار کر اس کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ مقتولین کی ہڈیاں عرصۂ دراز تک میدان میں بکھری رہیں۔ اسی لیے اس مقام کا نام "ہڈیاں والہ" پڑ گیا۔ آج کل اسے "ہڈال" کہتے ہیں۔

جب احمد شاہ درانی نے ہندوستان پر قبضہ کیا تو اس قبیلہ کا سردار لال خان تھا۔ اس نے حملہ آور کی دامے درمے مدد کی اور سرکار دربار میں عزت پائی، جس پر اس کے بھائی مبارک خان کو حسد آیا اور اس نے لال خان کو قتل کر دیا۔ تاہم لال خان کے لڑکے فتح خان نے بہت جلد انتقام لے لیا اور مبارک خان کو بہاول پور بھاگنے پر

مجبور کر دیا۔

سکھوں کے زمانے میں اس قبیلے کو شروع میں نقصان اٹھانا پڑا لیکن اس کے ایک فرد فتح خان نے رنجیت سنگھ کا "خراجی" ہونا قبول کر لیا۔ رنجیت سنگھ نے اسے خوشاب کے ایک رئیس ظفر خان کے خلاف استعمال کیا اور اسے جھنگ کی جاگیر بخش دی۔ اس کے بعد سکھوں نے اس کے بیٹے لنگر خان کو مختلف اضلاع میں جاگیروں سے نوازا۔ لنگر خاں نے انگریز کی بھی بڑی خدمت کی اور افغان جنگ میں حصہ لیتا رہا۔ راجہ ہیرا سنگھ نے اسے فتح خان ٹوانہ کا مقابلہ کرنے پر مامور کیا لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ تاہم محاصرۂ ملتان میں لنگر خاں نے بعض ایسے کارنامے دکھائے کہ انگریز نے خوش ہو کر اسے جاگیروں اور انعاموں سے نوازا جو ورثہ میں اس کی اولاد کو ملے۔ اس خاندان میں سے مبارک خان کے چھوٹے بھائی کا لڑکا سردار محمد چراغ انگریز کا ڈویژنل درباری تھا۔

ٹوانوں کی ایک اور شاخ کا سربراہ سردار بہادر ملک جہان خان تھا، جس نے ملک صاحب خان کے رسالے میں شامل ہو کر جہلم اور انبالہ کی لڑائیوں میں حصہ لیا اور مجاہدین کو تہ تیغ کیا۔ وہ جنرل نیپئر کے ہمرکاب سی پی کی مہمات میں شریک رہا۔ اسے اور اس کی اولاد کو گورا فوج کی خدمت کے صلہ میں کئی اعزاز اور تمغے دیے گئے۔

ملک جہان خان کی شادی پڈالی کے ملک غلام حیدر خان ٹوانہ کی لڑکی سے ہوئی۔ ملک غلام حیدر تمام ٹوانوں کا مورثِ اعلیٰ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بیٹے اور پوتے خاندان کی روایت کے مطابق گورا فوج کے ملازم رہے۔ اس کے تینوں بیٹے رسالدار میجر تھے۔ وہ پڈالی ہی میں رہتے تھے اور تین ہزار گھماؤں زمین کے مالک تھے۔

ٹوانوں کی ایک اور شاخ کے سربراہ نواب ملک خدا بخش تھے۔ وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج میں ملازم تھے۔ ان کی خدمات کے عوض سکھوں نے ان کو ہموکات نام گاؤں کے مالکانہ حقوق دے دیے تھے۔

ملک خدا بخش ٹوانہ کی اولاد میں سے ملک سلطان محمود نے ایڈورڈس کے ساتھ ملتان کی لڑائی میں حصہ لیا اور رسالدار کے علاوہ انسپکٹر پولیس بھی مقرر ہوا۔ اس کے بیٹے ملک خدا بخش کے پاس خواجہ آباد کی اسٹیٹ کے علاوہ بے شمار زرخیز زمین تھی جس کے سیراب کرنے کے لیے ایک پرائیویٹ نہر کھودی گئی۔ وہ کابل میں انگریز کا سفیر بھی رہا ہے۔ اسے نواب کا خطاب ملا۔ اس کے بیٹے ملک اللہ بخش خاں ٹوانہ نے ایچی سن کالج میں تعلیم پائی۔ ہموکا فیملی کے سربراہ ملک صاحب خاں تمام انعام و اکرام کے وارث ہوئے۔

مٹھا ٹوانہ میں نون بھی آباد ہیں جو دراصل ٹوانوں کے رشتہ دار ہیں۔ ان کا مورث اعلیٰ راجہ گنج نامی ایک ہندو راجپوت تھا۔ اس خاندان میں سے ملک خاں اور ملک جہان خاں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوجی خدمت کی اور کئی دیہات جاگیر کے طور پر حاصل کیے۔ بغاوتِ ملتان کے زمانہ میں ملک فتح خاں نے ایڈورڈس کا ساتھ دیا اور جہلم اور بنوں کے اضلاع میں کئی قلعے برباد کیے۔ اسے بارہ سو روپیہ پنشن ملتی رہی۔ اس کے بیٹے ملک محمد حیات خاں کے پاس بھیرہ میں ساڑھے تین ہزار ایکڑ زمین تھی۔

نون خاندان کا سربراہ ملک محمد حاکم خاں جنگِ آزادی 1857ء میں ملک فتح شیر خاں ٹوانہ کے رسالے میں شامل تھا۔ اسے بھی پنشن کے علاوہ تحصیلداری کا عہدہ ملا۔ اس کے پاس پانچ ہزار ایکڑ زمین تھی جس کا کچھ حصہ اس نے انگریز حکومت سے سستے داموں خریدا۔ اسے خان بہادر کا خطاب بھی دیا گیا۔ اس کا بیٹا ملک شیر محمد خاں انگریزی دور کا آنریری مجسٹریٹ رہا ہے۔ ملک فیروز خاں نون قیام پاکستان سے پہلے وزیر تعلیم تھے اور قیام پاکستان کے بعد مختلف مرکزی اور صوبائی عہدوں پر متمکن رہے۔ وہ مسلم لیگ زرعی اصلاحات کمیشن کے رکن تھے۔ انہوں نے پنجاب میں کوئی ایسی اصلاح نہ ہونے دی جس کا فائدہ مزارعین کو پہنچ سکتا۔

حمیدی

باب 8

مغل میرزے

سلطنت مغلیہ کے اقتدار کو جس "گھر کے چراغ" نے آگ دکھائی' وہ میرزا الٰہی بخش تھا جس کی ایک بیٹی بہادر شاہ ظفر کے بڑے لڑکے میرزا فخرو سے بیاہی ہوئی تھی۔ جب انگریز نے دہلی کا محاصرہ کیا تو جاسوسی کے فرائض ادا کرنے والا میرزا الٰہی بخش تھا۔ بیگم زینت محل سے اس کے تعلقات تھے' اس لیے شاہی محل کی خبریں فراہم کرنا اس کے لیے چنداں دشوار نہ تھا۔ اس نے نہ صرف پچاس گوروں کی جان بچائی بلکہ انگریزی سپاہ کو دریائے جمنا پر کشتیوں کا پل توڑنے میں بھی عملی امداد بہم پہنچائی۔ اسی پر بس نہیں' اس نے خضر سلطان اور ابوبکر شہزادوں کا پتہ بھی ہڈسن کو بتا دیا جس نے ان کو قتل کر کے ان کی لاشوں کو سڑک پر گھسیٹا۔ پھر اس نے بہادر شاہ ظفر کو بھی مجبور کیا کہ وہ انگریز حملہ آوروں کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔ انہی خدمات کے عوض میرزا الٰہی بخش کو 22,830 روپے کی سالانہ پنشن کے علاوہ دہلی' میرٹھ اور رہتک کے کئی دیہات کی جاگیر بھی عطا کی گئی۔ میرزا الٰہی بخش کے بعد میرزا ثریا جاہ المعروف بہ کیوان شاہ کو مغلوں کا نمائندہ تسلیم کر لیا گیا۔ اس وقت پاکستان میں مغلیہ شاہی خاندان کے سربراہ صاحبِ عالم میرزا خیر الدین خورشید جاہ رہائش پذیر ہیں لیکن ان کا میرزا الٰہی بخش سے کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے۔ ان کا شجرۂ نسب بہادر شاہ کے لڑکے میرزا معظم بخت سے جا ملتا ہے۔ میرزا فیاض الدین ان کے والد اور میرزا کبیر الدین ان کے دادا ہیں۔ ان کو کوئی "جاگیر" یا "بڑی زمینداری" وراثت میں نہیں ملی' البتہ نواب شاہ (سندھ) میں ان کی زمین موجود ہے۔

مغل بادشاہوں کی دوسری اولاد برصغیر کے مختلف علاقوں میں بکھر کر رہ گئی ہے۔ ایک شاخ کا تعلق راجوری کے رہلو خاندان سے ہے جس کی ایک خاتون سے شہنشاہ اورنگزیب نے شادی کر لی تھی۔ اس کے یہاں بہادر شاہ ظفر پیدا ہوا۔ انگریزوں نے اس خاندان کے افراد خصوصاً راجہ عظیم اللہ خاں کو انعام و اکرام اور جاگیروں سے نوازا۔ لیکن 1905ء کے زلزلہ میں قلعہ رہلو کی تباہی کے ساتھ ہی یہ خاندان بھی مٹ گیا۔

مغل میرزوں کی ایک شاخ قادیان سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ سمرقند کے ایک برلاس مغل ہادی بیگ کی اولاد ہے جو بابر کے عہد میں ضلع گورداسپور (مشرقی پنجاب) میں جا کر آباد ہو گیا۔ اس خاندان کے پاس قادیان لاہور اردگرد کے 82 دیہات کی جاگیر تھی لیکن آپس کی لڑائی جھگڑوں نے سب ضائع کر دی۔ آخر رنجیت سنگھ نے میرزا غلام مرتضیٰ کو فوجی خدمات کے عوض اس جاگیر کا متبدل واپس کر دیا۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں اس خاندان

نے انگریز کا ساتھ دیا اور جنرل نکلسن سے تعریفی سرٹیفکیٹ پایا۔ میرزا غلام مرتضیٰ کی وفات کے بعد میرزا سلطان احمد اس خاندان کے سربراہ مقرر ہوئے جو پہلے نائب تحصیلدار پھر ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ میرزا غلام احمد نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔ ان کے ورثا نے اپنی جائیداد الگ بنائی۔ سندھ میں اس خاندان کے پاس وسیع قطعات موجود ہیں۔

حمیدی

باب 9

بہاولپور کے نواب

پنجاب کے جنوب مغرب اور سندھ کے شمال مشرق میں دریائے سندھ اور ستلج کے درمیان تین سو میل لمبی اور پچاس میل چوڑی ریاست بہاولپور کی بنیاد اگرچہ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں رکھی گئی تاہم اسے "نوابی" اور "جاگیر" کا درجہ انگریزی کے زمانہ میں عطا ہوا۔ اس ریاست پر داؤد پوتوں کی حکمرانی ہے جو اپنے آپ کو حضرت عباسؓ (رسول کریمؐ کے چچا) کی اولاد کہتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ کے زمانہ میں حضرت عباسؓ کے بیٹے عرب سے ہجرت کر کے خراساں کے رستے سندھ میں آکر آباد ہو گئے۔ یہاں انہوں نے دریائے سندھ سے نہریں نکالیں اور وسیع رقبہ پر قابض ہو کر کھیتی باڑی کرنے لگے۔ 1739ء میں نادر شاہ نے انہی میں سے ایک شخص صادق محمد خاں اول کو "نواب" کے خطاب سے سرفراز کیا اور بہاولپور کی تمام زمینوں کا مالک بنا دیا۔ تاہم یہ ریاست کئی برس تک چھوٹی چھوٹی نوابیوں میں تقسیم رہی اور مالکانہ حقوق کسی ایک کے نام نہ ہو سکے۔ آخر صادق ملک خان کے پوتے بہاول خان دوم نے ریاست کے بکھرے ہوئے عناصر کو یکجا کیا اور قبیلے کے تمام سرداروں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر لیا۔ بہاول خان نے رفتہ رفتہ ملتان اور اردگرد کے کئی اضلاع پر بھی قبضہ کر لیا۔ 1802ء میں اس نے کابل کے شاہ محمد کی اجازت سے ایک ٹکسال قائم کی اور اپنا سکہ علیحدہ چلایا۔ کچھ عرصے بعد جب سکھوں کو اقتدار حاصل ہوا تو یہ نوابی بھی ختم ہو گئی۔ تاہم بہاول خان سوم (1825ء) نے انگریزوں سے ایک معاہدہ کر کے اسے سکھوں سے واگزار کرا لیا۔ 1838ء میں جب انگریزوں نے افغانستان سے جنگ کی تو بہاول خاں نے ان کی بھرپور مدد کی جس سے خوش ہو کر برطانوی حکومت نے اسے اپنی پناہ میں لے لیا۔ اس کے بعد سکھوں کی دوسری لڑائی میں بھی جب ملتان نے بغاوت کی تو یہی بہاول خان مُول چند کا محاصرہ کرنے میں پیش پیش تھا۔ ان خدمات کے عوض انگریز نے اس کی ایک لاکھ روپیہ پنشن مقرر کر دی اور ساٹھ لاکھ روپیہ انعام کے طور پر دیا۔ 1863ء میں داؤد پوتوں نے نواب بہاولپور خان چہارم کے خلاف بغاوت کی لیکن اسے سختی سے کچل دیا گیا۔ اس کے فوراً بعد نواب کی پُراسرار حالات میں موت واقع ہو گئی جس پر انگریزوں نے صادق محمد خاں چہارم کو جانشین مقرر کر کے ریذیڈنسی خود سنبھال لی۔ 1879ء میں جب نواب بالغ ہوا تو اسے نوابی واپس کر دی گئی۔ اس اثناء میں ریاست کو ہر لحاظ سے ترقی یافتہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی اس لیے آمدنی بھی چودہ لاکھ سالانہ سے بڑھ کر بیس لاکھ روپے ہو گئی۔ نواب صادق خان نے دوسری افغان جنگ میں انگریز کی

بھرپور امداد کی اور بیس ہزار اونٹ، سینکڑوں خچر اور بیل انگریزی سپاہ کی نقل و حرکت کے لیے وقف کر دیے۔ اس کے علاوہ نواب نے سوڈان اور مصر میں انگریز کا ساتھ دیا۔ ان خدمات کے صلہ میں لارڈ رپن نے اسے خطابات سے نوازا اور نواب صادق خان کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نواب بہاول خان پنجم گدی پر بیٹھا۔ یہ لارڈ کرزن کا عہد تھا۔ اس نے بھکیاں کو بھی ریاست میں شامل کرنے کا حکم دیا۔ تاہم نواب نوعمری ہی میں فوت ہو گیا اور صادق محمد خان پنجم اس کا جانشین مقرر ہوا۔ نواب بہاولپور نے تحریک پاکستان کا ساتھ دیا اور آزادی کے بعد بہاولپور کو سندھ کا حصہ بنانے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ تاہم ریاست کی زرخیز ترین زمینوں پر اب بھی امیر بہاولپور کا قبضہ ہے۔ ایوب حکومت نے زرعی اصلاحات کے ذریعے نہ صرف تمام زمینوں پر ان کو اور ان کے خاندان کو قابض رہنے کی اجازت دے دی بلکہ مویشی فارم کھولنے کے لیے مزید بیس ہزار ایکڑ دے دیے۔

نواب ممدوٹ

دسمبر 1971ء کی جنگ میں خبر آئی تھی کہ پاکستان کی فوجوں نے فیروزپور میں ممدوٹ کی جاگیر پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہ جاگیر دراصل 1570ء میں شہنشاہ اکبر نے قندھار کے پٹھانوں کو آباد کرنے کے لیے قائم کی تھی۔ ممدوٹ کے سردار حسن زئی قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب سکھوں نے زور پکڑا تو انہی پٹھانوں نے ان کا مقابلہ کیا لیکن گلاب سنگھ نے اس آبادی پر قبضہ کر لیا۔ اس جاگیر کے دو سردار نظام الدین اور قطب الدین سکھوں کی فوج میں بھرتی ہو گئے اور کوشش کر کے اپنا علاقہ واپس لے لیا۔ تاہم یہ جاگیر ہمیشہ حاکم لاہور کے ماتحت رہی۔ 1824ء میں قطب الدین خان کو لاہور کی لوٹ مار کی پاداش میں ساڑھے بارہ سو روپیہ جرمانہ بھی ہوا۔ دراصل چوری اور ڈاکہ اس علاقے کے لوگوں کا پیشہ بن چکا تھا۔ ان کے ایک سردار جمال الدین کو نوابی کا خطاب ملا لیکن وہ عیش و عشرت کا دلدادہ تھا۔ اس کے زمانہ میں لوٹ مار کو اور بھی فروغ ہوا۔ آخر انگریز نے اسے پنشن دے کر لاہور بلا لیا۔ ملتان کی جنگ میں ممدوٹ نے انگریز کی قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ 1857ء میں جلال الدین (جمال الدین کے بھائی) نے فیروزپور اور بہاولپور کے درمیان ہرکارے کے فرائض سرانجام دیے۔ وہ انگریز کے خفیہ پیغامات پہنچانے پر مامور تھا۔ ان خدمات سے خوش ہو کر انگریز گورنر جنرل نے نہ صرف جلال الدین کو نواب تسلیم کر لیا بلکہ اسے ممدوٹ میں رہنے کی اجازت بھی دیدی۔ اس کے بعد نواب نظام الدین خان نے گدی سنبھال لی۔ اس کے زمانہ میں جاگیر نے بہت ترقی کی اور آمدنی میں خاصا اضافہ ہو گیا۔ تاہم نواب چونکہ اسراف پسند تھا اس لیے ساری عمر مقروض رہا۔ 1899ء میں اس کی وفات کے بعد نواب قطب الدین کو جانشین بنایا گیا۔ نواب قطب الدین کی تعلیم ایچی سن کالج لاہور میں ہوئی۔ اس نے شادی بھی نواب لوہارو (سر امیر الدین خان) کی بیٹی سے کی۔ نواب سر شاہنواز خان جنہوں نے مسلم لیگ کا ہمیشہ ساتھ دیا، نواب عطاء الدین خان (المعروف خان بہادر خان) کے صاحبزادے تھے۔ وہ پہلے نظام حیدر آباد کے آئی جی تھے۔ اس کے بعد اپنی جاگیر پر واپس آ گئے اور زیادہ تر لاہور میں رہے۔ ان کے صاحبزادے نواب افتخار حسین خان تھے جو پنجاب کے وزیر اعلیٰ بھی رہے۔ قیام پاکستان کے بعد جاگیر تو بھارت میں رہ گئی، البتہ اس کے عوض کچھ زمین ساہیوال میں الاٹ ہوئی۔

ممدوٹ کے پاس ہی قصوریوں کی ایک جاگیر ہے جس کا بانی ایک بھٹی راجپوت محمد حیات خان تھا۔ اس کے

بیٹے، پوتے ہمیشہ ممدوٹ کے ملازم رہے لیکن مخبری کے صلہ میں انگریز نے ان کو جاگیر عطا کردی۔ ان میں سے شمس الدین خان نے میجر لارنس (ریذیڈنٹ لاہور) کی بے شمار خفیہ خدمات سرانجام دیں۔ اس کے بیٹے سردار خان کو فیروزپور کے قریب چھ سو گھماؤں زمین ملی۔ اس کے بعد اس کے بیٹے محمد عمر خاں کو خاندان کا سربراہ تسلیم کرلیا گیا۔

حمیدی

باب 11

لُڈن کے دولتانے

دولتانوں کا تذکرہ "روسائے پنجاب" میں نہیں ہے تاہم ان کا شمار پنجاب کے بڑے زمینداروں میں ہوتا ہے۔ ان کی اسٹیٹ ملتان کی تحصیل وہاڑی میں واقع ہے۔ جب میاں ممتاز دولتانہ برسراقتدار آئے تو ان کے پاس ساڑھے چھ سو مربع کے قریب زمین تھی لیکن ایوب خان کی زرعی اصلاحات کے نتیجہ میں ان کو چار سو مربع حکومت کے حوالے کرنا پڑے۔ بایں ہمہ ان کے خاندانوں نے اپنا بہت سارو پیہ شہری جائیدادوں اور کارخانوں کے حصص میں منتقل کر رکھا ہے جس کی بنا پر ریاض دولتانہ کا شمار 22 امیر ترین خاندانوں میں ہوتا ہے۔

دولتانوں کا مورث اعلیٰ بڈھن تھا جس نے اپنے نام پر بڈھن نام کا ایک گاؤں بھی آباد کیا۔ دولتانہ ان قبائل میں سے ہے جو سکندر اعظم کے حملہ سے بہت پہلے دریائے ستلج کے کنارے آکر آباد ہوا۔ مارس نام ایک سیٹلمنٹ افسر نے 1858ء میں بندوبست کی کتاب میں لکھا ہے کہ ستلج کے ساحل پر میلسی کی تحصیل میں جویا نام ایک قبیلہ کے تریسٹھ گاؤں تھے۔ یہ قبیلہ بیکانیر کے راجپوتوں کا تھا۔ خیال ہے کہ پندرہویں صدی میں یہ لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے ستلج کے دونوں کناروں پر قبضہ کرلیا۔ کننگھم کا خیال ہے کہ جویا دراصل یاندھی قبیلہ کے خاندان سے تھے جو سکندر اعظم کے حملہ سے پہلے یہاں آیا۔ یہ لوگ آٹھ سو برس قبل یعنی بارہویں صدی میں مسلمان ہوئے۔ ان میں سے دو بھائی بہت مشہور ہوئے۔ رائے جلال الدین اور رائے کمال الدین۔ ان کو سلطان دہلی نے ایک بھٹی سردار کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ انہوں نے بھٹی کو تہ تیغ کرکے اس کا قلعہ مسمار کردیا اور ان میں سے جلال الدین اسی جگہ آباد ہوگیا۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک قبیلہ سالدھیر یہاں آ نکلا۔ اس نے لڈن کو آباد کیا۔ پھر دولتانے آئے جن کا سربراہ بڈھن خان تھا۔ اس کا وارث غلام محمد لڈن ہوا جس کی مورس نے بہت تعریف کی ہے۔

قیام پاکستان سے پہلے اس خاندان کے جس فرد نے شہرت حاصل کی وہ میاں احمد یار خاں دولتانہ تھے۔ وہ اپنے اثر ورسوخ کی بنا پر پنجاب کی سیاست پر اثر انداز ہوئے۔ وہ یونینسٹ پارٹی کے سربرآوردہ رکن تھے۔ ان کی جائیداد پر کئی لاکھ کا قرض ہوگیا جو ان کے فرزند میاں ممتاز دولتانہ نے اتارا۔ میاں ممتاز دولتانہ بھی سیاست میں سرگرم حصہ لیتے رہے اور نواب ممدوٹ کے بعد پنجاب کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ آزادی سے پہلے اور بعد پنجاب کی تاریخ جن بڑے زمینداروں نے مرتب کی، ان میں میاں ممتاز دولتانہ بھی شامل ہیں۔ 1949ء میں

انہوں نے زرعی اصلاحات کے لیے مسلم لیگ کی ایک کمیٹی مقرر کی لیکن ان کے اپنے علاوہ پنجاب کے دوسرے بڑے زمینداروں نے اس کی سفارشات کو ناکام بنا دیا۔ اگرچہ مجوزہ قوانین کا مقصد زمینداروں کے حقوق کے تحفظ کے سوا کچھ نہ تھا۔ تاہم بڑے زمیندار اتنا بھی گوارا نہ کر سکے کہ مزارعین کو بھی ان کے تھوڑے بہت حقوق دیے جائیں۔

حمیدی

باب 12

گیلانی مخدوم زادے

پنجاب کے جو زمیندار پیری مریدی کے طفیل بڑے بن گئے' ان میں گورمانی اور گیلانی نمایاں ہیں۔ گیلانی مخدوم زادے ملتان میں وسیع اثر و رسوخ کے مالک رہے ہیں۔ وہ شیخ سید محمد غوث کی اولاد ہیں جو پیرانِ پیر کے نویں خلیفہ تھے۔ شیخ غوث سولہویں صدی میں ترکی سے ہجرت کر کے اوچ (بہاولپور) میں آکر آباد ہوئے۔ ان کے ایک پڑپوتے پیر موسیٰ پاک شہید کی اولاد میں سے نواب سید یحییٰ اور نواب سید موسیٰ پاک دین مغل بادشاہوں کے زمانہ میں ملتان کے گورنر بھی رہے ہیں۔ پیر موسیٰ کا مزار ملتان میں ہے۔ سجادہ نشین "خیر خواہانِ برطانیہ" میں سے تھے۔ ان کو میجر ہربرٹ ایڈورڈ سل نے ایک سند بھی دے رکھی ہے جس میں ان کی وفاشعاری کی تعریف کی ہے۔ سر جان لارنس نے بھی جنگ آزادی میں قوم فروشانہ خدمات پر مخدوم سید نور شاہ کو ایک سند اور تین سو روپے کی ایک خلعت عطا کی تھی۔ "پیر سید ولایت شاہ" کو 1876ء میں "گیلانی رئیس" قرار دے کر آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد مخدوم سید صدر الدین شاہ "صوبائی درباری" کہلائے۔ ان کے پنجاب اور سندھ کے علاوہ افغانستان میں بھی مرید تھے۔ اسی طرح سید شیر شاہ اور سید راجن شاہ اے ای سی اور میونسپل کمشنر مقرر ہوئے۔

باب 13

گورمانی نواب

گورمانیوں کے مرید تو موجود ہیں لیکن گورمانی ٹھٹھہ اب خانقاہ کی حیثیت سے اہم نہیں رہا۔ اس گاؤں کی بنیاد اس طرح پڑی تھی کہ جب حاکم ملتان بہلول خاں 1450ء میں سلطان دہلی بنا تو اس نے دریائے سندھ اور کوہ سلیمان کے درمیان کا علاقہ اپنے بھتیجے اسلام خاں کے سپرد کر دیا۔ اسلام خاں کے پوتوں نے اراضی آپس میں بانٹ لی۔ طاہر خاں کے حصے سیت پور کا علاقہ آیا جو آج کل علی پور تحصیل کہلاتا ہے۔ اس کے بھائیوں کو ڈیرہ غازی خاں کے بانی بلوچ خاں نے مار بھگایا لیکن طاہر خاں کی اولاد اپنی جائیداد پر قابض رہی۔ تاہم اردگرد کے بلوچی اس خاندان کو تنگ کرتے رہے اور آخر زمین پر قابض ہو گئے۔ گورمانی انہی کی نسل میں سے ہیں۔ ان میں سے میاں محبوب بہت بڑے زمیندار تھے۔ وہ مجسٹریٹ اور درباری بھی تھے۔ 1884ء میں ان کو خان بہادر کا خطاب بھی ملا۔ میاں محبوب اپنے باپ دادا کے مزاروں کے متولی تھے۔ ان کے مرید پنجاب کے جنوبی علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ خان بہادر محبوب کے بعد میاں شیخ احمد نے جائیداد کا ورثہ پایا۔ مشتاق احمد گورمانی ان کے بھائی میاں محمد زمان کے صاحبزادے ہیں۔ قیام پاکستان سے پہلے بہاولپور کے وزیر اعظم تھے۔ اس کے بعد پاکستان کے وزیر داخلہ اور مغربی پاکستان کے گورنر رہے۔ صدر ایوب کی زرعی اصلاحات کے باوجود ان کے پاس وسیع قطعاتِ اراضی ہیں۔

باب 14

مالیر کوٹلہ کے نواب

رئیس مالیر کوٹلہ کی اولاد پاکستان میں آباد ہے اور اس نے (مثلاً نوابزادہ رشید علی خان نے) حصول آزادی سے پہلے اور بعد مسلم لیگ کی جو قابل قدر خدمات سرانجام دیں' اس کا اعتراف سب کو ہے لیکن اس تاریخی حقیقت پر پردہ کیسے ڈالا جا سکتا ہے کہ جس ریاست کو سکھوں نے پے در پے حملوں سے خاکستر کر کے رکھ دیا تھا' اس میں اگر کوئی چنگاری پیدا ہوئی تو وہ انگریز کے "دمِ مسیحا" کا اعجاز تھا۔

مالیر کوٹلہ کا خاندان سلاطین دہلی کی ملازمت کے لیے 1467ء میں کابل سے ہجرت کر کے آیا۔ اس کے سربراہ شیخ صدر الدین نے سلطان بہلول لودھی کی لڑکی سے شادی کی تو جہیز میں تین لاکھ روپے اور 58 گاؤں ملے۔ اس خاندان کے پانچویں وارث بازید خان کو نواب کا خطاب شاہ عالمگیر نے دیا۔ بازید خان ہی نے کوٹلہ کا قلعہ تعمیر کرایا اور اسی بنا پر یہ ریاست "مالیر کوٹلہ" کہلائی۔ جب سکھوں نے مار دھاڑ شروع کی تو مالیر کوٹلہ کے ایک نواب شیر محمد نے نہ صرف ان کی سرکوبی کی بلکہ گورو تیغ بہادر کو گرفتار کر کے دہلی بھجوایا۔ اس کے علاوہ گورو گوبند سنگھ کے خاندان کی ایک عورت کو کلمہ پڑھا کر اس سے نکاح بھی کر لیا۔ تاہم کچھ عرصہ کے بعد سکھوں نے پھر طاقت پکڑ لی اور انہوں نے دو چار دیہات کے علاوہ پوری ریاست مالیر کوٹلہ کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

1803ء میں جب انگریزوں نے اپنے پاؤں پھیلائے تو مالیر کوٹلہ کے بچے کھچے رؤسا نے ان کا ساتھ دیا اور جنرل میک کے ساتھ مل کر نہ صرف مرہٹوں کا مقابلہ کیا بلکہ ستلج کے آس پاس کے علاقہ میں انگریزی اقتدار کی جڑیں مضبوط کیں۔

1809ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مالیر کوٹلہ سے ڈیڑھ لاکھ کا تاوانِ جنگ طلب کیا جس میں سے پچاس ہزار تو نقد دے دیا گیا اور بقایا کے لیے پانچ دیہات سکھوں کے پاس رہن رکھ دیے گئے۔ 1809ء میں اس ریاست کو انگریز نے از سرِ نو زندہ کیا اور اس کے رؤسا کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ چنانچہ رحمت علی خان نے گورکھوں کی لڑائی میں سر آچرلونی کی جنگی ساز و سامان اور اونٹ گھوڑوں سے پوری پوری مدد کی۔ ادھر رحمت علی خان کا بھائی فضل علی بھرت پور کے محاصرہ میں انگریز کے دوش بدوش لڑا۔ پھر 1846ء میں معرکہ ستلج کو کامیاب بنانے کے لیے مالیر کوٹلہ نے سات سو سوار دیے جن کی کمان اس زمانہ کے نواب نے اپنے ہاتھ میں تھامی۔

ان تمام خدمات کے عوض انگریز نے تین دیہات نواب کو بخش دیے جو ریاست مالیر کوٹلہ کے جزو رہے ہیں۔ اس کے بعد وراثت کے جھگڑے اٹھے لیکن اس دوران میں بھی مالیر کوٹلہ کے نوابوں نے کابل اور گورکھا لڑائیوں میں حصہ لیا، جس کے صلہ میں نواب امیر خان کو "ہز ہائی نس" کا خطاب ملا۔

غرض جو جاگیر اور زمینداری سکھوں نے ختم کردی تھی اسے انگریز نے از سرنو زندہ کردیا اور نواب کا خطاب بھی بحال ہوگیا۔ اسی پر بس نہیں، 1877ء میں نواب مالیر کوٹلہ کو دہلی دربار میں کرسی پیش کی گئی اور اسے دو مزید توپوں کی سلامی کی اجازت عطا ہوئی۔

ریاست مالیر کوٹلہ کے رؤسا کو "خوانین" بھی کہا جاتا ہے۔ وہ دراصل نواب بہادر خان کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کو اعتراض یہ تھا کہ سابقہ نواب نے سکندر علی کو اپنا متبنّٰی کیوں بنایا۔ جب 1878ء میں غلام محمد خان فوت ہوگیا تو اس کی ریاست اور جاگیر کے مالکانہ حقوق اس کے پانچ بیٹوں کو منتقل ہوگئے جن میں سے محمد علی خان اور ذوالفقار علی خان مشہور ہوئے۔ ان دونوں کی تعلیم اچی سن کالج لاہور میں ہوئی۔ خان ذوالفقار علی خان (جن کو بعد میں سر کا خطاب ملا) پہلے لدھیانہ کے آنریری ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ بعد میں وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بھی رہے۔ ان خوانین کے نواب مالیر کوٹلہ سے تعلقات بھی اچھے نہیں رہے۔ تاہم ان کی موروثی حیثیت انگریز نے تسلیم کر رکھی تھی۔ نواب کا خطاب مغل بادشاہ نے دیا لیکن وہ سکھوں کے زمانہ میں ختم ہوچکا تھا۔ اس کے بعد انگریز نے تجدید کی لیکن خان ذوالفقار علی خان کے حصہ میں وہ بھی نہ آسکا۔ خان محمد علی خان میرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے داماد تھے۔ ان کو بھی یار لوگ "نواب" کہتے تھے حالانکہ نوابی کا "خوانین" سے کوئی تعلق نہ رہا تھا۔

باب 15

قزلباش نواب

انگریز نے لاہور میں جن لوگوں کو "نوابی" عطا کی، ان میں قزلباش خاندان کو امتیازی درجہ حاصل ہے۔ "قزلباش" ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "سرخ بالوں والا"۔ قزلباش قبیلہ بحیرۂ کیسپین کے ساحل پر آباد تھا اور اپنی شوریدہ سری، بغاوت اور لوٹ مار کے لیے بدنام تھا۔ گریفن کا بیان ہے کہ ایران کا بادشاہ ان لوگوں کو ہمیشہ شاہِ کابل کے خلاف بھڑکاتا رہتا تھا۔ جن لوگوں کو گرفتار کرلیا جاتا، ان کو مجرموں کی "سرخ ٹوپی" پہنادی جاتی اور اسی بنا پر وہ "قزلباش" کہلائے۔ ایک اور مؤرخ کا بیان یہ ہے کہ اس قبیلہ کے افراد شاہ ایران کی فوج میں بھی بھرتی ہوئے۔ ان کی وردی میں "سرخ ٹوپی" شامل تھی، اس لیے وہ قزلباش مشہور ہوگئے۔

بہرحال تاریخ پنجاب سے ثابت ہے کہ جب نادر شاہ نے 1738ء میں ہندوستان پر حملہ کیا تو اس کی فوج میں قزلباش موجود تھے۔ وہ ان لوگوں کو بھرتی کرکے اپنے ہمراہ لے آیا تھا مبادا وہ اس کی عدم موجودگی میں شورش برپا کریں۔ تاہم ان لوگوں نے بڑی وفاداری سے بادشاہ کی خدمت کی اور اس کی مہمات کو کامیاب بنایا جس سے خوش ہوکر اس نے ان کے لیے ایک امیر علی خان کو قندھار کا گورنر بنادیا۔ اسی طرح دوسرے قزلباش سرداروں کو بھی مختلف عہدوں پر متمکن کردیا۔

1839ء میں جب انگریزوں نے کابل پر حملہ کیا تو قزلباشوں نے ان کی بھرپور امداد کی اور ان کی فوجوں اور قیدیوں کے تمام مصارف برداشت کیے بلکہ ان کو اپنے گھروں میں پناہ دی، تاہم جب انگریزوں کو پسپا ہونا پڑا تو وہ بھی اپنے سفید فام آقاؤں کے ساتھ ہندوستان آگئے۔ یہاں آکر انہوں نے انگریزوں کے دوش بدوش کانگڑہ اور کشمیر میں مسلمان فوجوں کا مقابلہ کیا اور صلہ میں خطابات اور جاگیریں پائیں۔ ان میں سے علی رضا خاں انگریزوں کا خاص معتمد تھا جس کو نواب کا موروثی خطاب ملا۔ علی رضا خاں کے بعد نوازش علی خاں قزلباش کے نواب قرار پائے۔ ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی ناصر علی خان کو جانشین بنایا گیا جن کے وارث ان کے بھتیجے نواب فتح علی خاں قرار پائے۔ وہ پنجاب اسمبلی کے نامزد رکن تھے۔ انگریزوں نے ان کو سی آئی ای کا خطاب بھی دیا۔ اب اس خاندان میں امتیازی حیثیت نواب مظفر علی خاں کو حاصل ہے جو متعدد مرتبہ مرکزی اور صوبائی وزارت کے عہدوں پر متمکن رہ چکے ہیں۔ اس خاندان کے پاس ضلع لاہور میں وسیع قطعاتِ اراضی ہیں جن میں سے بعض "تعزیہ" اور "دلدل" کے نام وقف ہیں۔

PakDigestNovels.Blogspot.Com

باب 16

بخاری فقیر

سکھوں اور انگریزوں کے درمیان جس شخص نے "واسطہ" کا کام دیا' وہ فقیر عزیز الدین تھا۔ اس کے والد کا نام غلام شاہ تھا جس کا خاندان پہلے اوچ (بہاولپور) میں رہتا تھا' پھر چونیاں (لاہور) میں اٹھ آیا۔ اس خاندان کا بانی ایک عرب باشندہ جلال الدین تھا جو ساتویں صدی عیسوی میں بخارا میں آکر آباد ہو گیا۔ فقیر اور درویش ہونے کے باعث لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ لیکن حاکم بخارا ہلاکو خاں کو (جو بت پرست اور ظالم تھا) اس سے نفرت ہو گئی۔ اس نے حکم دیا کہ جلال الدین کو زندہ جلا دیا جائے لیکن اس کا کچھ بھی نہ بگڑا۔ حاکم بخارا بے حد متاثر ہوا۔ وہ نہ صرف مسلمان ہو گیا بلکہ اپنی بیٹی جلال الدین سے بیاہ دی۔ اسی نسبت سے یہ خاندان "بخاری فقیر" کہلاتا ہے۔ تاہم ایک روایت یہ بھی ہے کہ پہلے یہ لوگ اپنے آپ کو "انصاری" لکھتے تھے لیکن فقیر عزیز الدین نے اپنے آپ کو "بخاری سید" کہنا شروع کر دیا۔ اصل واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جلال الدین کی وفات کے بعد جب یہ خاندان جڑ پکڑ گیا تو عبداللہ انصاری نام لاہور کے ایک حکیم نے اس کی امداد کی اور اس کے ایک یتیم بچے غلام محی الدین کو اپنے خرچ پر پڑھایا لکھایا۔ فقیر عزیز الدین اسی غلام محی الدین کا لڑکا تھا۔ وہ لاہور کے ایک ہندو وید حاکم رائے کا شاگرد تھا۔ 1799ء میں جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کیا تو فقیر عزیز الدین نے مہاراجہ کی آنکھوں کا علاج کیا۔ اس کے صلہ میں فقیر کو انعام و اکرام ملا جس میں بعض دیہات کی جاگیرداری بھی شامل تھی۔ 1808ء میں جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مٹکاف کو مار بھگانا چاہا تو فقیر عزیز الدین نے مہاراجہ کو روک دیا۔ اس طرح انگریزوں کو پنجاب میں اپنے قدم مضبوط کرنے کا موقع مل گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے فقیر عزیز الدین کو مسلمان سرداروں کے خلاف بھی استعمال کیا اور کئی مہمات اسی کے ذریعہ سر کیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر فقیر عزیز الدین غداری نہ کرتا تو نہ سکھوں کو پنجاب میں پاؤں پسارنے کا موقع ملتا' نہ انگریز اتنی آسانی کے ساتھ اس صوبہ پر قبضہ کر سکتے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی موت کے بعد بھی فقیر عزیز الدین انگریزوں اور سکھوں کے درمیان "رابطہ" کا کام کرتا رہا' اسی لیے لارڈ ایلن بیرو نے بھرے دربار میں اسے "دونوں مملکتوں کی دوستی کا محافظ" قرار دیا تھا۔

فقیر عزیز الدین کے چھ لڑکے تھے جن کو انگریزی سرکار دربار میں خاصا رسوخ حاصل رہا۔ ان میں سے ایک لڑکے ظہور الدین کو گوجرانوالہ میں پانچ سو ایکڑ زمین کے علاوہ پنشن اور انعامات دیے گئے۔ دوسرے (شمس

الدین) کو تحصیل لاہور میں نو سو ایکڑ موروثی جاگیر ملی۔ ظہور الدین کا بڑا لڑکا افتخار الدین لاہور میں دو سو ایکڑ اور لائل پور میں ایک ہزار ایکڑ زمین کا مالک بن گیا۔ فقیر عزیز الدین کے تیسرے بیٹے قمر الدین کو نہ صرف خلعت ملی بلکہ ایجرٹن نے اسے تحصیل لاہور میں سات سو ایکڑ زمین بھی دی جہاں اس نے اپنے دوسرے لڑکے کے نام پر ایک گاؤں جلال آباد بھی آباد کیا۔ اس کے علاوہ 1905ء میں اسے چناب کالونی میں دس مربع زمین ملی۔

PakDigestNovels.Blogspot.Com

باب 17

کالاباغ کے نواب

کالاباغ کئی نسلوں سے اعوان ملکوں کے قبضہ میں ہے۔ یہاں کے پہاڑوں سے نمک نکلتا ہے اور اب لوہا بھی دریافت ہوا ہے۔ قریب ہی دریائے سندھ بہتا ہے جس میں دونوں طرف پچاس پچاس میل تک کشتی رانی ہو سکتی ہے۔ اسی سہولت کے باعث حملہ آور ہمیشہ اس رستہ سے دریائے سندھ کو عبور کر کے پنجاب میں داخل ہوتے رہے ہیں۔ کالاباغ عین اس مقام پر واقع ہے جہاں دریائے سندھ پہاڑوں سے اتر کر میدان میں داخل ہوتا ہے۔

اعوان ملک یہاں سولہویں صدی میں آکر آباد ہوئے۔ ان کا پہلا پڑاؤ ڈانت کوہ پر تھا جو کالاباغ سے اوپر کی جانب ایک قدرتی قلعہ ہے۔ جب کبھی حملہ کا خطرہ ہوتا لوگ اسی میں آکر پناہ لیتے تھے۔ سب سے پہلے اعوان آبادکار کا نام شیخ عدو تھا۔ اس کے پوتے بند علی نے نمک کی کانوں پر اپنا قبضہ جمالیا اور پورے علاقے کا سردار بن گیا۔ وہ ملاح بھی تھا' اس لیے کشتیوں کے ذریعے جو لوگ دریائے سندھ عبور کرنا چاہتے' ان سے کرایہ کے علاوہ نمک کا محصول بھی لیتا۔ کالاباغ کے شمال میں بھنگی خیل خٹک آباد تھے۔ اس نے ان سے خراج لینا شروع کر دیا۔ اگرچہ وہ زمانہ بدامنی اور پریشانی کا تھا اور آئے دن حملے ہوتے رہتے تھے' تاہم اعوان ملکوں نے پوری جرأت سے حالات کا مقابلہ کیا اور آخر قرب وجوار کی تمام اراضی پر قابض ہو گئے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں تیمور شاہ نے کالاباغ کے علاقہ میں اعوان ملکوں کی فرمانروائی تسلیم کر لی اور محمد اعظم خاں اعوان کو بارہ سو روپیہ سالانہ دیے تاکہ وہ دہلی اور کابل کے درمیان رستہ کو پرامن اور محفوظ رکھے۔

1822ء میں جب سکھوں نے اس علاقہ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ملک علی یار خاں کو یہاں کی جاگیر بخش دی۔ وہ مالیہ کے علاوہ مہاراجہ کو دو گھوڑے' گیارہ اونٹ' پانچ کتے' محصول نمک کا دو تہائی اور مسان زمینوں کے مالیہ کو 2/5 دیا کرتا تھا۔ سکھوں کے عہد میں اعوان ملکوں کو بہت فائدہ پہنچا۔

جب انگریز آئے تو علی یار خاں نے ان کی پوری پوری مدد کی اور ایڈورڈس کو بنوں اور دلیپ گڑھ کی مہمات میں سامان رسد اور گھوڑا سواروں کی کمی نہ آنے دی۔ گھوڑ سواروں کا سردار خود اس کا بیٹا مظفر خاں تھا جو ملک فتح خاں ٹوانے کے دوش بدوش لڑتا رہا لیکن آخر گجرات میں اسے ہتھیار ڈالنے پڑے اور اسے قیدی بنا لیا گیا۔ بعد ازاں پانچ ہزار روپیہ تاوان لے کر اسے رہا کر دیا گیا۔

1857ء کی جنگ آزادی میں اعوان ملکوں کا کردار وہی تھا جو دوسرے بڑے زمینداروں نے ادا کیا۔ مظفر خاں اور اس کے بیٹے یار محمد نے ایک سو سپاہی بھرتی کر کے ایڈورڈس کی کمان میں دے دیے' جس نے ان کو پشاور کے دروازوں پر متعین کر دیا۔ مظفر خان کو خان بہادر کا خطاب ملا۔

1863ء میں باپ کی وفات کے بعد مظفر خاں رئیس کالاباغ بن گیا۔ وہ سرحد کی حفاظت پر مامور رہا۔ اس نے جنگ افغانستان میں انگریز کی بڑھ چڑھ کر مدد کی۔ ملک یار محمد خاں بھی اپنے باپ کے دوش بدوش انگریز کا خدمت گزار رہا۔ چنانچہ اسے نہ صرف کالاباغ کی کانوں کے ٹھیکے ملے بلکہ عیسیٰ خیل اور میانوالی کی جاگیریں بھی اس کے حصے آئیں۔ 1907ء میں اسے خان بہادر کا خطاب ملا۔ اس کے بعد ملک عطا محمد خاں خاندان کے سربراہ قرار پائے۔ ملک امیر محمد خاں رتبا زخاں کے صاحبزادے تھے جو خان بہادر مظفر خاں کے بھائی تھے۔ ملک امیر محمد خاں کو نواب کا خطاب ورثہ میں ملا۔ وہ مغربی پاکستان کے گورنر بھی رہے ہیں۔ انہوں نے بڑے زمینداروں کی حمایت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا بلکہ جب بھی زرعی ٹیکس کی تجویز پیش ہوتی' ملک صاحب ہی اس پر خط تنسیخ کھینچتے تھے۔

کالاباغ میانوالی میں ہے جس کی بنیاد گکھڑوں کے زمانہ میں میاں علی نام ایک بزرگ نے رکھی تھی۔ وہ بغداد سے آئے تھے اور یہاں کے پٹھانوں کو اکسایا کہ گکھڑوں کا تختہ اقتدار الٹ دیں۔ ان کے صاحبزادے سلطان زکریا بھی پیر تھے اور ان سے کئی کراماتیں منسوب ہیں۔

1847ء میں سلطان زکریا کے بیٹوں نے انگریزوں کی امداد کی اور اس کے صلہ میں ان کی جاگیر' جو پہلے عارضی تھی' مستقل ہو گئی۔ زکریا کی اولاد میں حسین علی نے ملک فتح خاں ٹوانہ کی ایک ہمشیر سے شادی کر لی۔ اس لیے ٹوانوں کے ساتھ میانوالی کی میاں فیملی کا رشتہ ہے۔ ان لوگوں نے بھی پیری مریدی کے طفیل اپنی زمینداری کو مستحکم کیا تھا۔

PakDigestNovels.Blogspot.Com

باب 18

گکھڑ راجے

تاریخ ہند میں جس قبیلہ کا سب سے زیادہ ذکر آتا ہے وہ گکھڑ ہے۔ وہ سینکڑوں برس تک پنجاب کے پہاڑی اور میدانی علاقوں میں دندناتے رہے ہیں۔ انہوں نے اعوانوں، گوجروں، کھٹڑوں اور جنجوعوں سے لڑائیاں لڑیں اور ان کے علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ اس کی وجہ ان کی یکجہتی ہے۔ وہ آپس میں بھی لڑتے جھگڑتے رہتے تھے لیکن جب کبھی مشترک دشمن سے واسطہ پڑتا تو سب اکٹھا ہو جاتے۔

گکھڑوں کی ابتدا کے بارے میں اختلاف ہے۔ ان کا اپنا بیان یہ ہے کہ وہ ایرانی النسل ہیں۔ وہ سلطان کیدو کی اولاد ہیں جس نے تبت فتح کیا تھا۔ اس کی سات پشتیں تبت کی حکمران رہیں۔ اس کے بعد جب سلطان کاب گدی پر بیٹھا تو اس نے کشمیر بھی فتح کرلیا جہاں گکھڑوں کی تیرہ پشتیں حکمرانی کرتی رہیں۔ آخر کشمیریوں نے ان کے خلاف بغاوت کی اور رستم نام بادشاہ کو قتل کردیا تو اس کا بیٹا بھاگ کر کابل میں سلطان ناصرالدین سبکتگین کے پاس چلا گیا۔

اس کے برعکس کہا جاتا ہے کہ گکھڑوں نے کشمیر کبھی فتح نہیں کیا۔ وہ 300ء میں خراسان سے آکر پنجاب میں آباد ہوئے۔ ان کے ایک سردار راجہ ہودی نے سیالکوٹ کے راجپوت سردار راجہ رسالو کی بیٹی سے شادی کرلی۔ بعض مؤرخ اس روایت کو بھی صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ بہرحال یہ طے ہے کہ جنجوعوں کی طرح گکھڑ بھی پنجاب کے قدیم باشندوں میں سے ہیں اور ان کا تاریخ میں ایک کردار ہے۔

فرشتہ کا بیان ہے کہ گکھڑ ساتویں صدی عیسوی سے پنجاب میں رہتے ہیں۔ انہوں نے افغانوں سے معاہدہ کرکے لاہور کے راجہ کا مقابلہ کیا۔ گکھڑوں کے اپنے بیان کے مطابق سبکتگین نے کابل خاں کو ملازم رکھ لیا۔ اس کے دوسرے بیٹے کا نام گکھڑ شاہ تھا۔ وہ سلطان محمود غزنوی کے ہمراہ پنجاب میں آیا اور یہاں آکر اس نے اپنے نام پر ایک قبیلہ کی داغ بیل ڈالی۔ رفتہ رفتہ اس نے جہلم اور سندھ کا درمیانہ علاقہ فتح کرلیا جس کو "پوٹھوہانہ" کہتے ہیں۔

گکھڑ شاہ کے بھتیجے راجر خاں نے ڈنگی نام ایک گاؤں آباد کیا۔ کہتے ہیں وہاں ڈان نام ایک جن رہتا تھا جو اردگرد کے علاقے کے لیے وبال جان بنا ہوا تھا۔ راجر خاں نے اسے ہلاک کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس غرض کے لیے اس نے ایک پیر کی خدمات مستعار لیں۔ پیر نے جن کے غار کا منہ اچھی طرح بند کرکے آگ لگادی، لیکن جن ایک سوراخ سے نکل کر غائب ہوگیا۔ اسی جن کے نام پر یہ گاؤں ڈان گلی آباد ہے۔

راجر خاں کے بعد صفر خاں اور صفر خاں کے بعد منگ خاں گکھڑوں کا سردار مقرر ہوا۔ اس نے فدائی خاں کھوکھر سے مل کر سلطان محمد غوری کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جس نے اپنے جرنیل قطب الدین ایبک کو گکھڑوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا تھا۔ گکھڑوں نے اس وقت پورے پنجاب میں ادھم مچا رکھا تھا اور ان کے قتل وغارت کا سلسلہ لاہور تک وسیع تھا۔ تاہم وہ ایبک کے مقابلہ کی تاب نہ لاسکے۔ ایبک ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ گکھڑوں کا قتل عام کیا جائے کہ منگ خان نے سلطان محمد غوری کو موت کے گھاٹ اتارنے کا فیصلہ کرلیا۔ سلطان واپسی کے وقت دریائے سندھ کے کنارے خیمہ زن تھا۔ رات بہت گرم تھی اس لیے ہوا کے لیے خیموں کی قناتیں اٹھادی گئی تھیں۔ چند گکھڑ دریا پار کرکے آئے۔ پہرے دار نے دیکھا تو خطرے کی آواز نکالی لیکن اس سے پہلے کہ بچاؤ کا کوئی انتظام ہوتا، گکھڑ شاہی خیمہ میں داخل ہوگئے اور سلطان کو اوپر نیچے بائیس وار کرکے خنجر سے ہلاک کردیا۔ سلطان تو نہ بچ سکا لیکن حملہ آوروں کو اسی وقت ایذائیں دے دے کر ہلاک کردیا گیا۔

منگ خان کے بعد لوہار خان گکھڑوں کا سردار بنا۔ اس کے زمانے میں ناصرالدین محمود نے پوٹھوہار پر حملہ کیا اور کئی ہزار گکھڑوں کو غلام بنا کرلے گیا۔ ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے 1241ء میں مغلوں کی مدد کی تھی۔ لوہار خاں کے بھتیجے نے رہتاس میں اپنا ایک علیحدہ قلعہ تعمیر کیا۔ اس خاندان کے افراد اب بھی رہتاس اور ڈومیلی میں آباد ہیں۔ جب تیمور نے حملہ کیا تو گکھڑوں کا سردار گل محمد تھا۔ اس کی اولاد میں سے ایک شخص جستر خاں نے کشمیر پر حملہ کیا اور علی شاہ کو پکڑ کر قید کرلیا۔ اس کے بعد اس نے جالندھر پر قبضہ کیا اور دہلی کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ لدھیانہ پہنچا تھا کہ شاہی فوجوں نے اسے مار بھگایا۔ وہ راولپنڈی چلا آیا اور یہاں سے اس نے یکے بعد دیگرے لاہور اور جموں پر حملے کیے۔ اس نے جموں کے راجہ رائے بھیم کو شکست دے کر مار ڈالا۔ جب بابر نے حملہ کیا تو گکھڑوں کا سردار ہتی خاں تھا۔ ہتی خاں نے بڑی مشکل سے گکھڑوں کے گڑھ "پہاڑ والا" پر قبضہ کرلیا لیکن ایک رستہ سے بابر کی فوجیں داخل ہوئیں تو دوسرے سے ہتی خان بھاگ نکلا۔ تاہم اس کے بھائی سارنگ خاں نے بابر کی اطاعت قبول کرلی۔

بابر نے اپنی توزک میں گکھڑوں کا ذکر کیا ہے۔ اس نے جنجوعوں پر چڑھائی کرکے ان کا بے دریغ خون بہایا تھا۔

گکھڑوں نے دہلی جاکر بابر کو سلامی بھی دی جس کے نتیجہ میں پوٹھوہار کا علاقہ بدستور ان کے پاس رہنے دیا گیا۔

1541ء میں شیر شاہ نے ہمایوں کو ہندوستان سے نکالنے کے بعد رہتاس کا مشہور قلعہ بنایا جہاں اس نے جنرل خواص خاں کو بارہ ہزار کی فوج دے کر پہرہ بٹھادیا تاکہ ہمایوں دوبارہ نہ آسکے۔ لیکن گکھڑوں کے سردار سارنگ خاں کو بابر کا احسان ابھی تک یاد تھا۔ وہ رہتاس پر گاہے گاہے حملے کرکے شیر شاہ کی فوج کو ہراساں کرتا رہا۔ شیر

شاہ کے بعد اس کے بیٹے سلیم شاہ نے گکھڑوں کو سزا دینے کا فیصلہ کرلیا۔ سارنگ خاں نے مجبور ہو کر پناہ مانگی لیکن سلیم شاہ نے اس کے بیٹے کو زنجیروں سے جکڑ کر قید خانے بھجوادیا۔ 1550ء میں ہمایوں کے بھائی کامران نے گکھڑوں کے پاس آکر پناہ لی۔ پہلی دفعہ تو گکھڑوں نے اس کی آؤ بھگت کی لیکن دوسری مرتبہ جب وہ سلیم شاہ کے سلوک سے نالاں ہو کر پھر آیا تو سارنگ کے بھائی آدم خاں نے قبیلہ کی روایات کے صریح خلاف اسے پکڑ کر ہمایوں کے حوالے کردیا۔ ہمایوں نے اس کی آنکھیں نکال لیں اور اس کے بعد خود ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ جب وہ فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل ہو رہا تھا تو اس کے ساتھ گکھڑوں کا سردار بھی تھا۔ اسے غداری کا صلہ مل گیا تھا۔

احمد شاہ ابدالی کی آمد تک گکھڑ چناب سے سندھ تک وسیع علاقے پر قابض ہو چکے تھے۔ ان کی طاقت صرف بھنگی سرداروں نے آکر توڑی۔ ان کا ایک ایک علاقہ چھین لیا گیا اور ان کے افراد کو دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کردیا گیا۔ تاہم انگریز کی آمد پر ایک گکھڑ راجہ حیات اللہ خان کو جب کیپٹن ایبٹ نے سکھوں کی قید سے رہا کرایا تو اس نے انگریز کی تن من دھن سے خدمت کی۔ راجہ حیات اللہ نے ہزارہ اور ملتان کی لڑائیوں میں حصہ لیا اور جب ڈھنڈ قبیلہ نے کوہ مری میں گوروں پر حملہ کیا تو یہی شخص انگریز کی طرف سے پیش پیش تھا۔ اس کے صلہ میں اسے راولپنڈی کے گکھڑوں کا سردار تسلیم کرلیا گیا اور اسے پنشن بھی دی گئی۔ گکھڑوں کی سلطنت اب ختم ہو چکی ہے' تاہم اس کے آثار پہاڑوالہ میں اب بھی موجود ہیں۔ اس کے افراد نے انگریز سے گراں قدر انعام پایا۔ راولپنڈی کے کئی دیہات میں ان کو دوامی جاگیریں ملی ہوئی ہیں۔

PakDigestNovels.Blogspot.Com

باب 19

گوجرانوالہ کے چٹھے

چودھری محمد حسین چٹھہ نے میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ کے ساتھ مل کر پنجاب کی سیاست میں جو حصہ لیا اس سے تاریخ کے طالب علم بے خبر نہیں ہیں۔ چٹھے زیادہ تر گوجرانوالہ کے ضلع میں حافظ آباد اور وزیر آباد کے پرگنوں میں آباد ہیں۔ ان کا مورث اعلیٰ ایک ہندو راجپوت چوہان گگو تھا جس نے 1600ء کے لگ بھگ اسلام قبول کیا۔ چٹھوں نے دریائے چناب کے کنارے بہت سے دیہات آباد کیے جن میں منجر' بنگلی اور پنڈوردیاں مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ احمد نگر' رسول نگر اور کئی قلعے بھی انہوں نے آباد کیے تھے جن میں سے بعض کے نام سکھوں نے بدل دیے۔ گگو کی اولاد میں سے نور محمد (1740ء) نے کافی طاقت پکڑلی۔ اس لیے ملتان کے سرداروں کے علاوہ جموں کے راجہ رنجیت دیو نے بھی اس سے یارانہ گانٹھ لیا۔ جب نور محمد بوڑھا ہو گیا تو اس کے بیٹے احمد خان نے چٹھوں کو اپنے اردگرد جمع کرلیا اور قرب وجوار کے علاقوں میں مار دھاڑ شروع کردی۔ اس کی سب سے زیادہ دشمنی گوجرانوالہ کے سکرچاکیہ خاندان سے تھی کیونکہ وہ بھی بڑی بڑی زمینوں پر قبضہ جمانے میں مصروف تھا۔ سردار چرت سنگھ کے زمانہ میں چٹھوں کو عروج پانے کا موقع ملا۔ اس نے گوجرانوالہ میں بھنگیوں کی توپ گاڑ رکھی تھی۔ احمد خاں نے اس پر قبضہ جمالیا۔ اس کے بعد احمد خاں کی اپنے بھائی پیر محمد سے ٹھن گئی۔ دونوں کی لڑائی ہوئی جس میں احمد خاں کے دو بیٹے اور بھتیجا مارا گیا۔ پیر محمد نے گوجر سنگھ اور صاحب سنگھ بھنگی دو سکھ سرداروں کو اپنے ساتھ ملا کر احمد خاں کو پکڑلیا اور تب تک بھوکا پیاسا قید میں رکھا جب تک اس نے بھنگیوں کی توپ واپس نہ کردی۔

جب احمد شاہ درانی نے پنجاب پر حملہ کیا تو اس نے چٹھوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا اور جس گاؤں پر اس کا فرستادہ میر منو بھی زبردستی قبضہ نہ کرسکا اسے لے کر چٹھوں کو پھر واپس کردیا۔ چٹھوں کا دشمن سردار چرت سنگھ 1774ء میں مرگیا جس کے بعد نور محمد اور پیر محمد بھی راہیٔ عدم ہو گئے۔

لیکن قبائلی سرداروں کی باہمی دشمنی اور رقابت ختم نہ ہوئی' بلکہ ان کی اولاد سالہا سال تک ایک دوسرے سے برسرپیکار رہی۔ کبھی چٹھے جیت جاتے اور کبھی چرت سنگھ کے وارث۔ 1790ء میں ایک سردار ماہن سنگھ نے چٹھوں کے گاؤں منجر کا محاصرہ کرلیا جو چھ ماہ تک جاری رہا۔ اس اثناء میں کئی سکھ مارے گئے۔ ان دنوں چٹھوں کا سردار غلام محمد تھا۔ اس کے چچا حشمت خان نے محاصرہ کو توڑنے کے لیے آخری حربہ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ خود ہاتھی پر چڑھ کر سکھوں پر حملہ آور ہوا اور قریب تھا کہ ماہن سنگھ کے بیٹے رنجیت سنگھ کو قتل کر دیتا کہ اچانک اس کے ہمراہیوں نے اسے کھینچ کر ہاتھی سے اتارلیا۔ جب غلام محمد نے دیکھا کہ اب قلعہ کا بچنا

ناممکن ہے تو اس نے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیے کہ مجھے حج پر جانے دیا جائے۔ ماہن سنگھ مان گیا لیکن جونہی اس نے ہتھیار پھینکے، سکھ سرداروں نے اسے مار ڈالا اور چٹھوں کے گاؤں کو لوٹ لیا۔ اس کے علاوہ بے شمار علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس موضوع پر پنجابی میں ایک رزمیہ نظم "چٹھیاں دی وار" بھی ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔

غلام محمد کا بیٹا جان محمد بھاگ کر کابل چلا گیا اور شاہ زمان خان کو ساتھ لے کر آیا جس نے پورا علاقہ فتح کر کے اس کے حوالے کر دیا۔ لیکن جونہی شاہ زمان کی واپسی ہوئی، رنجیت سنگھ نے رسول نگر پر حملہ کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ چٹھوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ چٹھے بے جگری سے لڑے لیکن سکھ فوج کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ گئی۔ کہتے ہیں کہ پیروں اور ولیوں نے بھی اس موقع پر چٹھوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ چٹھوں نے اپنے گاؤں کے ایک پیر کو دعا کے لیے کہا تو اس نے جواب دیا "تمہاری امداد میرے اختیار سے باہر ہے۔ پیران پیر (شیخ عبدالقادر جیلانیؒ) خود سبز چولہ پہن کر سکھوں کے شانہ بشانہ تمہارے خلاف لڑ رہے ہیں"۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جان محمد کو توپ کا ایک گولہ لگا اور اس کے مرتے ہی قلعہ کے دروازے سکھوں کے لیے کھل گئے۔

رنجیت سنگھ نے جان محمد کے ورثا کو کچھ جاگیر دی اور ان کو اپنی فوج میں بھرتی کر لیا۔ جب انگریز آئے تو چٹھے ان کے ساتھ جا ملے۔ ان کے سردار کرم الٰہی کو انعام میں معافی (نوے روپے سالانہ) بارہ سو گھماؤں اراضی اور لائل پور کے بعض مکانوں اور دکانوں کی ملکیت ملی جس سے پانچ ہزار دو سو روپیہ سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ چٹھہ خاندان کے افراد کو عہدے اور منصب عطا کیے گئے۔ اس وقت جو چٹھے جاگیروں اور زمینداریوں کے وارث ہیں وہ جان بخش نام ایک معمولی چوہدری کی اولاد میں سے ہیں۔ جان بخش ایک رسہ گیر تھا جو مال مویشی اٹھا کر لے جاتا تھا۔ وہ اپنے دشمن سردار ماہن سنگھ کے ہاتھوں 1794ء میں مارا گیا تھا۔ اس کے گاؤں کا نام گاجر گولہ تھا جس پر سکھوں نے حملہ کر کے اس کی ساری دولت لوٹ لی۔ جان بخش کی اولاد بھاگ کر پنڈی بھٹیاں چلی گئی تھی۔ جب رنجیت سنگھ تخت پر بیٹھا تو جان بخش کے بیٹے اور پوتے اس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس سے بارہ ہزار روپے کی ایک جاگیر پائی۔ جان بخش کے بیٹے خدا بخش نے سکھوں کے ساتھ مل کر قصور، ملتان، منکیرا، کشمیر اور پشاور کی لڑائیوں میں بھی حصہ لیا۔ "تیری" کی جنگ میں زخمی ہونے کے باوجود اس نے ایک ہی وار میں ایک افغان کا سر اڑا دیا۔ جنگ آزادی 1857ء کے زمانہ میں چٹھے انگریز کے وفادار رہے۔ خدا بخش کے دو پوتوں کو تھانیدار بنا دیا گیا۔ خود اسے ڈیڑھ ہزار روپیہ کی پنشن ملی۔ اس کے بعد چٹھوں کو گوجرانوالہ کے قرب و جوار میں دو ہزار سات سو ایکڑ اراضی دے دی گئی۔

باب 20

جھنگ کے سیال

جھنگ کے سیالوں کا قبیلہ بہت پرانا ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں ان کو عروج حاصل ہوا۔ وہ دریائے چناب کے کنارے آباد ہیں۔ ان کا مورث اعلیٰ رائے شنکر بھی ایک راجپوت تھا جو تیرہویں صدی میں الہ آباد اور فتح پور کے درمیانہ علاقہ سے آ کر یہاں آباد ہوا۔ اس زمانہ میں مغل جگہ جگہ ہندوؤں کی سرکوبی کر رہے تھے۔ اس لیے کئی راجپوت چھپ چھپا کر پنجاب کے دریاؤں کے آس پاس آ کر پناہ گزین ہو گئے۔ ان میں سے سیال، ٹوانے، گھیبے اور کھرل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بعد میں ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اور وسیع اراضی پر قابض ہو کر یہیں رہنے سہنے لگے۔ سیالوں کو پاک پٹن بہت پسند آیا جو اس زمانہ میں "اجودھیا" کہلاتا تھا۔ یہاں بابا فرید الدینؒ شکر گنج کا دربار تھا۔ رائے شنکر کے لڑکے سیال نے جب ان کی اثر انگیز باتیں سنیں تو فوراً مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد وہ شاہ پور کے ضلع میں ساہیوال کے مقام پر آیا جہاں اس نے بھاؤ خان کی لڑکی سہاگ سے شادی کر لی جس سے تین بیٹے ہوئے۔ بھربی، کوہلی اور مہانی۔ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی سیال خاندان کا مورث اعلیٰ ہے۔ کوہلی اپنا خاندان لے کر کوہستان اور کاچھی میں آباد ہو گیا۔ یہاں اس کی کئی نسلیں بھیڑ بکریاں چراتی رہیں۔ سیال کے پڑپوتے ملی خان نے چناب کے کنارے جھنگ سیال کی بنیاد رکھی۔ چار سال بعد مغل بادشاہ نے اسے دہلی طلب کیا اور یہی علاقہ اسے لیہ کے عوض دے دیا۔ اس کی اولاد نے رفتہ رفتہ قرب و جوار کا علاقہ بھی اپنے قبضے میں لے لیا اور بنجر علاقے میں کھیتی باڑی کرنے لگے۔ دہلی کی حکومت نے ایک سیال ولی داد خان کو چنیوٹ کا قلعہ بھی دے دیا۔ اس نے شور کوٹ، کھیوہ، میرک اور کوٹ کمالیہ سے مالیہ وصول کرنا شروع کر دیا اور اس طرح اس کی عملداری چناب سے راوی تک وسیع ہو گئی۔ اس کے بعد یہ جاگیر اس کے بھتیجوں کے ہاتھ آئی جو آپس میں جھگڑا فساد کرتے رہے۔ ان میں سے عنایت اللہ بہادر تھا۔ اس نے ملتان کے روسا اور بھنگی سرداروں کو جھنگ سے بھگانے کے لیے کم و بیش بیس لڑائیاں لڑیں تاہم اس وقت تک سکھ عروج پکڑ چکے تھے۔ چنیوٹ کو ایک بھنگی سردار کرم سنگھ نے فتح کر لیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس پر چڑھائی کر کے قلعہ واپس لے لیا۔ ان کے بعد مہاراجہ نے جھنگ پر حملہ کیا لیکن سیالوں کے سربراہ احمد خان نے اسے ساٹھ ہزار سالانہ کی پیشکش کر کے جان چھڑا لی۔ تین سال بعد مہاراجہ نے جھنگ پر پھر حملہ کیا اور قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ احمد خان بھاگ گیا۔ مہاراجہ نے یہ ضلع سردار فتح سنگھ کلیانوالہ کو ساٹھ ہزار روپے سالانہ کے عوض دے دیا۔ تاہم احمد خان جلد ہی نواب ملتان مظفر خان سے امداد لے کر واپس آیا اور قلعہ دوبارہ فتح کر لیا۔ مہاراجہ رنجیت

سنگھ چونکہ مہمات میں مصروف تھا اس لیے پہلے تو اس نے احمد خان کو اس علاقہ کا حاکم تسلیم کر لیا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ وہ مظفر خان کی حمایت کر رہا ہے تو وہ احمد خان کو گرفتار کر کے لاہور لے آیا۔ یہاں اس نے احمد خان سے صلح کر لی اور نہ صرف اس کی جاگیر بحال کی بلکہ مزید جاگیریں عطا کیں۔

جھنگ کے سیالوں نے انگریزوں کی خدمت کر کے انعام و اکرام بھی پایا۔ چنانچہ ان میں سے محمد اسماعیل خان کو نہ صرف جھنگ کے پولیس سواروں کا رسالدار بنایا گیا بلکہ جنگ آزادی کی گورا فوج کی امداد کے عوض اسے جاگیر، پنشن اور خلعت سے بھی نوازا گیا۔ بعد میں رابرٹ ایجرٹن کی سفارش پر جاگیر میں اضافہ کر دیا گیا اور اسماعیل خان کو میونسپلٹی اور صوبائی دربار میں عہدے بھی دیے گئے۔ اس خاندان کے پاس جاگیر کے علاوہ بیس دیہات کی زمین کے مالکانہ حقوق تھے۔ سیالوں کی شاخ ملتان کی تحصیل کبیر والا میں بھی آباد ہے اور اس کے افراد خطابوں اور عہدوں سے مالا مال ہیں۔

حمیدی

باب 21

کھرل خاندان

جھنگ کے سیالوں کی رشتہ داری کمالیہ کے کھرلوں کے ساتھ ہے۔ کھرل اپنا شجرۂ نسب چندر بنسی خاندان کے راجہ کرم کے ساتھ ملاتے ہیں جو ہستناپور کا راجہ تھا۔ کھرل زیادہ تر ساہیوال (منٹگمری) کے دلدلوں والے جنگلات میں آباد ہیں۔ ان میں سے بعض جھنگ، لاہور اور شیخوپورہ میں بھی رہتے ہیں جہاں تیس چالیس دیہات کی ملکیت ان کے پاس رہی ہے۔ انگریز کی نگاہ میں کھرل ایک جرائم پیشہ قبیلہ تھا جس کا کام قتل و غارت اور مار دھاڑ کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسلمان ہونے کی بعد کھرل مجاہدین کی صف میں شامل ہو گئے جن کو ہندو اقتدار ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ دیوان ساون مل اور سکھوں نے ان کے مجاہدانہ جوش و خروش کو ٹھنڈا کر کے رکھ دیا۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں انہوں نے انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا لیکن گورا فوج کی وحشت و بربریت کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ جا سکی۔

کھرل خاندان کا سربراہ کمال خان تھا جس نے سولہویں صدی میں جھنگ سے چالیس میل جانب جنوب کوٹ کمالیہ آباد کیا۔ یہاں سیال بھی رہتے تھے۔ کھرلوں کا دعویٰ تھا کہ سیال راجپوتوں کی طرف سے ان کے عزیز ہیں۔ اس کے باوجود دونوں قبائل کی آپس میں سر پھٹول ہوتی رہتی تھی۔ ایک دفعہ دہلی کا کوئی شہزادہ راستہ بھول کر ادھر جا نکلا۔ اس وقت کمال خان کا چوتھا وارث سعادت یار خان کمالیہ کا سردار تھا۔ شہزادہ اس کی شخصیت سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے زور دے کر کھرلوں اور سیالوں کی آپس میں صلح کرا دی اور یہ تجویز پیش کی کہ جھنگ سیال کا آٹھواں سردار غازی خان اپنی بیٹی کی شادی سعادت خان سے کر دے۔ اس پر جھنگ کے سردار برافروختہ ہو گئے اور انہوں نے شہزادے کو قتل کر دیا۔ تاہم بعد میں شہزادے کے ساتھیوں نے بھی سردار کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

مرزا بھی کھرل خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ مرزا اس قبیلہ کی شاہی شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔ اسے اپنی ایک خالہ زاد صاحباں سے محبت ہو گئی۔ وہ بھی مرزا پر جان چھڑکنے لگی۔ تاہم صاحباں ایک شخص خان زاد سے منسوب ہو چکی تھی۔ اس کے والدین نے دونوں کی شادی رچائی تو عین جس وقت بارات آئی مرزا نے صاحباں کو اغوا کر لیا اور اسے اپنی کوتل گھوڑی پر بٹھا کر دھن آباد کی جانب فرار ہو گیا۔ کھرل خاندان کے افراد نے اس کا پیچھا کیا اور آخر اسے اپنے اڈے پر پہنچنے سے پہلے ہی جا لیا۔ مرزا نے بڑی شجاعت سے مقابلہ کیا لیکن اتنے

افراد کے سامنے اس کی کچھ پیش نہ جا سکی اور وہ جان سے مارا گیا۔ خان زادے بہتیری کوشش کی کہ کسی طرح صاحباں کی جان بچ جائے لیکن کھرلوں نے اسے اپنے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا سمجھا اور اس کا بھی گلا گھونٹ ڈالا۔ اس کے بعد کھرلوں میں لڑکی کی پیدائش کو منحوس سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ جب بھی کسی کھرل کے یہاں لڑکی پیدا ہوتی اس کا گلا گھونٹ دیا جاتا تھا۔ آخر ملتان کے ایک انگریز کمشنر کرنل ہملٹن کے سمجھانے بجھانے پر کھرلوں نے اس رسم کو ترک کر دیا۔

جھنگ کے غازی کان کے لڑکے لال خان کو سعادت یار خاں سے بھی اتنی چڑ تھی جتنی اس کے والد سے۔ کمالیہ کا سردار اسے "طوائف زادہ" کہا کرتا تھا۔ ایک دفعہ طیش میں آکر اس نے سیالوں کو اکٹھا کیا اور کمالیہ پر ہلہ بول دیا۔ "باہر نکل اوئے" لال خان نے گاؤں کے پاس پہنچ کر آواز دی۔ "آ تینوں رنڈی دے پتر دا ناچ دکھاواں" لیکن سعادت خان دم سادھ کر بیٹھا رہا۔ لال خان نے گاؤں میں لوٹ مار مچائی اور بڑھکیں مارتا ہوا واپس چلا آیا۔

1798ء میں جب شاہ زمان نے پنجاب پر حملہ کیا اور سکھوں میں بھاگڑ مچ گئی تو حاکم ملتان مظفر خان نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے کمالیہ پر حملہ کر دیا اور سکھوں کو مار بھگایا۔ تاہم 1803ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس جاگیر کو لاہور کے ساتھ ملا لیا اور اس وقت کے رئیس سعادت یار خان کو چالیس دیہات کے مالکانہ حقوق بخش دیے۔ سکھ برابر اس جاگیر کی سرپرستی کرتے رہے بلکہ کچھ نئے دیہات کا بھی اس میں اضافہ کیا۔

1857ء میں جہاں تمام لوگوں نے انگریز کے خلاف علم جہاد بلند کیا ان کے ایک سردار سرفراز خان نے انگریز کی اطاعت و وفاداری کو اپنا شعار بنایا جس کے صلہ میں اسے 525 روپے کی جاگیر اور 500 روپے کی خلعت ملی۔ یہی شخص تھا جس نے راتوں رات کیپٹن الفنسٹن کے گھر پہنچ کر آدھا گھنٹہ پہلے مخبری کی کہ کھرل اس پر حملہ کرنے والے ہیں جس پر اس نے اپنی حفاظت کے لیے لاہور سے بروقت امداد طلب کر لی۔

سرفراز خان کی تمام جائیداد اس کے مرنے تک خورد برد ہو چکی تھی۔ تاہم انگریز نے اپنے اطاعت شعار ملازم کے فرزند امیر علی خان کو بھوکوں نہ مرنے دیا اور اسے نہ صرف ایک لاکھ روپیہ نقد دے کر تمام جائیداد واگزار کی بلکہ اسے ملتان اور لائل پور کے دو دیہات اور منٹگمری کے 38 دیہات کے تعلقداری حقوق عطا کیے۔ اس کے علاوہ لائل پور کے 64 دیہات اور منٹگمری کے دس دیہات کے مالکانہ حقوق دیے اور چناب کالونی میں ساڑھے سولہ مربعوں کے علاوہ کمالیہ کی اکثر عمارتوں اور زمینوں پر اس کی ملکیت تسلیم کر لی۔ کمالیہ کی جاگیر میں منٹگمری کے پانچ اور لائل پور کا ایک گاؤں بھی شامل ہے۔ منٹگمری کے اور لائلپور کے دو دیہات کی نمبرداری بھی سیالوں کے پاس ہے۔ 1872ء میں امیر علی خان اور جہان خان میں ذیل داری کے سوال پر جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ تاہم اسے جلد ہی چکا دیا گیا۔ گو اس کے بعد بھی خاندان کے ان دونوں افراد کی آپس میں بول چال بند رہی۔ جہان

خان کا لڑکا 1897ء تک اپنے گاؤں کمالیہ میں رہتا رہا۔ وہ بے حد کنجوس تھا اور اس نے بے شمار دولت جمع کر رکھی تھی۔ اس کا لڑکا شہزاد خان لائل پور میں چلا آیا جہاں وہ کئی مربعوں کا مالک اور نمبردار رہا ہے۔ اب بھی بے شمار دیہات میں کھرل خاندان کی سیادت قائم ہے اور اس کے افراد کا شمار رؤسا، جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں میں ہوتا ہے۔

باب 22

ملتان کے مخدوم قریشی

انگریز نے اس سرزمین پر قدم رکھا تو ہمارے علماء دو طبقوں میں بٹ گئے۔ ایک طبقہ نے اسے "کافر" اور "دجال" قرار دے کر علم جہاد بلند کر دیا۔ دوسرے نے اس کی خدمت و خوشامد کو اپنا شعار بنایا۔ پہلے طبقے کو اپنے عقائد کی سزا بھگتنا پڑی۔ انگریز نے اس کے رہنماؤں کو توپوں کے منہ سے باندھ کر اڑا دیا۔ دوسرا طبقہ فائدہ میں رہا۔ اس نے دین فروشی کے عوض بڑی بڑی زمینیں اور جاگیریں انعام میں پائیں۔ گورمانیوں اور گیلانیوں کی طرح ملتان کے مخدوم قریشیوں کا شمار اسی طبقہ میں ہوتا ہے۔

مخدوم قریشیوں کے بزرگ شیخ بہاء الدینؒ تھے جن کے علم و عرفان کے مداح تمام مسلمان ہیں اور جن کے مریدوں کا سلسلہ بھی بہت وسیع ہے۔ وہ تحصیل لیہ میں کوٹ کھروڑ کے مقام پر 1170ء میں پیدا ہوئے۔ شجرۂ نسب کے لحاظ سے وہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے چچا اسد کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے مورث سلطان حسین ہندوستان میں سلطان محمود غزنوی کے ساتھ آئے اور لیہ میں جا کر آباد ہو گئے۔ شیخ بہاء الدینؒ بچپن ہی سے درویشانہ مزاج رکھتے تھے۔ وہ گھر بار چھوڑ کر خراسان چلے گئے۔ جہاں انہوں نے شہاب الدینؒ سہروردی کی شاگردی اختیار کی۔ اس کے بعد وہ اسلامی ممالک کی سیاحت کرتے رہے۔ آخر 1222ء میں واپس ہندوستان پہنچے اور ملتان جا کر آباد ہو گئے۔

شیخ بہاء الدینؒ کے علم و فضیلت کی شہرت دور دور تک پھیلی تو شمس تبریزؒ بھی ادھر آ نکلے۔ جب شیخ کو پتہ چلا تو انہوں نے دودھ کا ایک لبالب پیالہ شمس تبریزؒ کو بھیجا جس سے اشارا یہ مقصود تھا کہ ملتان میں اب کسی اور فقیر یا درویش کی گنجائش نہیں ہے۔ شمس تبریزؒ نے دودھ پر ایک پھول رکھ کر پیالہ واپس کر دیا۔ مطلب یہ تھا کہ نہ صرف گنجائش موجود ہے بلکہ نووارد کی خوشبو شیخ سے بھی زیادہ پھیلے گی۔ اس پر شیخ برافروختہ ہو گئے۔ انہوں نے حکم دیا کہ ملتان کا کوئی شہری شمس تبریزؒ سے تعاون نہ کرے۔ شمس تبریزؒ خود تو بے نیاز تھے لیکن ان کے ہمراہی کو بھوک لگی تو اس نے شور مچایا۔ اس پر شمس تبریزؒ نے جنگل کی بکریوں کو آواز دی۔ وہ دوڑتی ہوئی آئیں اور دودھ کے لیے اپنے تھن پیش کر دیے۔ شمس تبریزؒ نے ان میں سے ایک بکری کو ذبح کیا اور اپنے نوجوان رفیق کو شہر بھیجا کہ کسی سے آگ لے آئے تاکہ گوشت پکایا جائے۔ لیکن شہر میں کوئی شخص بھی شمس تبریزؒ یا اس کے ہمراہی سے بات کرنے کو تیار نہ تھا۔ ایک دوکاندار نے اس کے منہ پر دودھ کا برتن دے مارا۔ وہ روتا ہوا اپنے پیر کے پاس پہنچا۔ شمس تبریزؒ نے بلند آواز سے کہا:

"اے شمس (سورج) تو ہی قریب آ کہ میں تیری حرارت سے کھانا پکاؤں۔ یہاں کے لوگ تو مجھے کھانے سے بھی محروم رکھنا چاہتے ہیں"۔

کہتے ہیں کہ اس پر سورج قریب آ گیا لیکن کھانا تیار ہونے کے بعد بھی ملتان کی فضا میں ٹھہرا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ملتان میں وہ باقی مقامات کی بہ نسبت ایک نیزہ نیچے ہے۔

کہتے ہیں اس واقعہ کے بعد شیخ بہاء الدین تقریباً ایک سو برس تک ملتان میں مقیم رہے اور رشد و ہدایت کی روشنی پھیلاتے رہے۔ ان کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے۔

سکھوں کے زمانہ تک اس مزار کے نام پر جو جاگیرداری رہی وہ ضائع ہو چکی تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے 1818ء میں ملتان فتح کیا تو مزار کے نام ساڑھے تین ہزار کا وظیفہ لگا دیا۔ انگریزوں نے پنجاب کا الحاق کیا تو سجادہ نشین کی جاگیر اور وظیفہ میں بھی اضافہ کر دیا۔ 1857ء کی جنگ میں اس خانقاہ کے جانشین مخدوم شاہ محمود نے انگریز کو خفیہ اطلاعات بہم پہنچائیں۔ گھوڑ سوار مہیا کیے اور اپنے مریدوں کو منع کیا کہ مجاہدین کا ساتھ نہ دیں۔ انگریز اس سے بہت خوش ہوا۔ اس نے شاہ محمود کو تین ہزار نقد انعام کے علاوہ 1780 روپے کی جاگیر اور آٹھ کنوئیں دیے۔ جب وائسرائے لاہور آیا تو اسے بھنگیاں والا باغ بھی بخش دیا گیا۔ شاہ محمود کی وفات کے بعد اس کی اولاد کو بھی بے شمار جاگیروں، زمینوں، انعاموں اور خطابوں سے نوازا گیا۔ اس خاندان کے بہت سے افراد بڑے بڑے عہدوں پر بھی متمکن کیے گئے۔

مخدوم قریشیوں کی ایک شاخ غوث پور میں آباد ہو گئی جہاں سے اس کے بعض افراد دھونکل (گوجرانوالہ) میں چلے گئے۔

باب 23

نمک سار کے جنجوعے

پنجاب کی زرخیز اراضی پر جس قبیلہ نے سب سے پہلے قبضہ کیا وہ جنجوعہ کہلاتا ہے۔ جنجوعے اڑھائی ہزار برس قبل مسیح سے ملتان اور جہلم کے درمیان آباد ہیں۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ راجپوت آباد کاروں کی تین نسلیں یکے بعد دیگرے پنجاب میں داخل ہوئیں۔ ایک یسوع مسیح سے قریباً اڑھائی ہزار برس پہلے جس کی یادگار کٹوچ اور چمبہ کے راجے اور جالندھر کی پہاڑیوں کے سردار ہیں۔ یہ لوگ کسی زمانے میں دو آبہ باری اور رچنا پر حکومت کرتے تھے۔ دوسری نسل تقریباً ایک ہزار سال بعد آئی۔ اس قبیلہ کا سردار ہستناپور کے راجہ کا بیٹا تھا۔ اس نے جہلم کے شمال میں ایک خانوادے کی بنیاد رکھی جو راولپنڈی سے ملتان تک حکومت کرتا رہا۔ آخر میں دکن کے راجپوت آئے جن کی اولاد جاٹ' ٹوانے' سیال' گھیبے اور کھوکھر وغیرہ کہلاتی ہے۔

ان میں سے جنجوعے ہستناپور کے راجپوتوں کی اولاد بتائے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی پہلی بستی دریائے جہلم کے شمال میں "نمک سار" پر بنائی جو اب بھی "جودھ پہاڑی" کہلاتی ہے۔ اسی کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ جنجوعے یدھ یا جودھ راجپوتوں کی نسل میں سے ہیں۔ بعض لوگ جنجوعوں کا رشتہ جویا اور جودھی راجپوتوں سے جا ملاتے ہیں لیکن بیکانیر کے جویا راجپوتوں کی عادت و خصائل جنجوعوں میں مفقود ہیں۔

بہرحال جنجوعوں کے متعلق تاریخی شہادت یہ ہے کہ وہ راجپوتوں کی قدیم ترین نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس خود جنجوعوں کی تحقیق یہ ہے کہ وہ ایک پانڈو راجہ مل کی اولاد ہیں اور پنجاب میں 980ء کے لگ بھگ آئے تھے۔ ان کا ابتدائی وطن جودھ پور یا قنوج ہے جن پر اسی زمانہ میں راٹھوروں کی حکومت تھی۔ جب راٹھور کے راجہ کو پتہ چلا کہ ایک پانڈو بھاگ کر جہلم کی شمالی پہاڑیوں میں جا چھپا تھا تو وہ بھی اپنے ساتھیوں سمیت اس علاقہ میں آکر آباد ہو گیا۔ اس نے راج گڑھ کے نام سے ایک گاؤں کی بنیاد رکھی جو آج کل ملوٹ کہلاتا ہے۔

جب سلطان محمود غزنوی نے پنجاب پر حملہ کیا تو اس نے راجہ مل کو بلا بھیجا لیکن اس نے حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔ اس سے برافروختہ ہو کر سلطان محمود غزنوی نے اس پر چڑھائی کی اور شکست دے کر اسے قید کر لیا۔ اتنے میں راجہ مل نے اسلام قبول کر لیا جس کے بعد اس کی جائیداد اسے واپس کر دی گئی۔ اس نے چونکہ "جنیئو" (ہندوؤں کا نشان دھاگہ) اتار پھینکا تھا اس لیے اس کا خاندان جنجوعہ کہلایا۔

راجہ مل کے دو بیٹے تھے۔ جودھ اور دیر۔ انہوں نے باپ کی جائیداد آپس میں بانٹ لی۔ جودھ نے مکراج کی نمک کی کانوں پر قبضہ کر لیا اور دیر میں پنڈ دادنخان کے قریب کھورا کا علاقہ لے لیا۔ ان لوگوں کی اولاد پھیلتی رہی اور اڑوس پڑوس پر قابض ہوتی رہی۔ 1358ء میں جب تیمور نے حملہ کیا تو جنجوعوں نے اس کا ساتھ دیا۔ اسی طرح 1526ء میں انہوں نے بابر کے سامنے گھٹنے ٹیکے۔ بابر نے اپنی توزک میں ان کا ذکر کیا ہے۔ جنجوعوں کے سب سے بڑے دشمن گکھڑ تھے۔ انہوں نے جنجوعوں کو کئی دیہات سے نکالا اور ان کی اراضی پر قبضہ کر لیا۔ اسی طرح اعوان بھی جنجوعوں کو پیچھے دھکیلتے رہے۔ اس کے بعد سکھ آئے تو وہ بھی جنجوعوں پر چڑھ دوڑے۔

انگریز کے زمانہ میں جس جنجوعے نے نام پایا اس کا نام ملک زمان مہدی خان تھا۔ اس نے جہلم کے انگریز ڈپٹی کمشنر کو مجاہدین کے بارے میں خفیہ اطلاعات بہم پہنچائیں جن کی بنا پر کئی مجاہد جو کشتی پر دریا پار کر رہے تھے گرفتار ہو گئے۔ اس کے بعد ملک زمان مہدی نے افغان جنگ میں حصہ لیا۔ ان خدمات کے عوض اسے انگریز کی بارگاہ سے تعریفی سند ملی اور اسے دربار ہی بنا لیا گیا۔ ملک زمان مہدی خان کے بعد اس کی اولاد نے بھی انگریز کی اطاعت و وفاداری کو جزو ایمان بنائے رکھا۔ جس کے صلہ میں ان کو فوجی عہدے' جاگیریں اور خطابات ملے۔ کوہستان نمک میں اب بھی ایسے جنجوعے آباد ہیں جن کے پاس انگریز کی دی ہوئی زمینیں اور جاگیریں ہیں۔

باب 24

پنڈ دادن خان کے کھوکھر

پنڈ دادن خان کے کھوکھر راجے بھی جنجوعوں اور گکھڑوں کے رشتہ دار ہیں۔ ان کی تاریخ اس زمانہ سے شروع ہوتی ہے جب دادن خان نام ایک کھوکھر راجپوت شہنشاہ جہانگیر کی ملازمت چھوڑ کر آیا تو "نمک سار" میں آباد ہو گیا۔ یہاں اس نے "شمس آباد نمک سار" کے آثار پر اپنے نام کی ایک بستی پنڈ دادن خان بسائی۔ اس علاقہ میں جنجوعے بھی رہتے تھے جن کو ایک اور قبیلہ تنگ کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ وہ اس علاقہ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ لہٰذا کھوکھروں کو پوری آزادی سے یہاں رہنے کا موقعہ مل گیا۔ نمک کی وجہ سے پنڈ دادن خان بہت جلد ایک شہر بن گیا جس میں تاجروں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ دادن خان کے تین لڑکے تھے جن کی اولاد احمد آباد اور پنڈ دادن خان میں اب تک رہتی ہے۔ شفیع خان نے چک شفیع میں ایک قلعہ بھی تعمیر کیا تاکہ گجروں اور جنجوعوں کے حملوں کی روک تھام ہو سکے۔ اسی طرح فتح محمد گوجر اور اگر خان نے سلطان کوٹ نام قلعے تعمیر کیے۔ اس کے بعد جانشینوں میں جھگڑا ہوا تو فیروز خان کا احمد خان پنڈ دادن خان چھوڑ کر چلا گیا اور پندرہ میل دور ایک علیحدہ گاؤں احمد آباد کی بنیاد رکھی۔ اس نے نور پور کے اعوانوں کو بھی مار بھگایا اور دہلی کے بادشاہوں سے اپنے حقوق ملکیت تسلیم کرا لیے۔

اس کے دو بیٹے تھے۔ خدا بخش اور فیض اللہ خان۔ راجہ خدا بخش خان نے 49-1848ء میں سکھوں کا مقابلہ کیا اور ملک شیر خان ٹوانے کی فوج میں شامل ہو کر جاگیر اور ملکیت اراضی بھی حاصل کر لی۔ بعد ازاں انگریز کے انعام و اکرام کی بارش اس کی اولاد پر ہوتی رہی اور یہ لوگ جو کھوکھر راجے کہلاتے تھے، زمینوں اور جاگیروں کے وارث بن گئے۔

باب 25

گجرات کے چب راجے

دریائے بیاس اور جہلم کے درمیان جو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ چلا گیا ہے اس میں راجپوتوں کا ایک قدیم خاندان چب رہتا تھا۔ گجرات کے ضلع میں یہی چب اکاون دیہات کے مالک تھے۔ ان کی ایک شاخ کانگڑہ اور جموں میں آباد ہوئی لیکن اس نے اسلام قبول نہیں کیا۔ چب راجپوت تو نہیں ہیں لیکن ان کا درجہ سلیری، ہرچند اور اسی قبیلے کے راجپوت گھرانوں کے برابر ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہیر چند کی اولاد ہیں جس نے کانگڑہ کے ایک راجہ کی لڑکی سے شادی کی تھی لیکن یہ درست معلوم نہیں ہوتا۔

بہرحال اس قبیلہ کا سردار چب چند تھا جس کی اپنے بھائی اودھے چند سے لڑائی ہو گئی اور وہ 1400ء میں کانگڑہ چھوڑ کر گجرات میں بھمبر کے قریب آ کر آباد ہو گیا۔ یہاں اس نے اپنی لڑکی کی شادی ایک مقامی راجہ سری پت سے کر دی لیکن وہ دولت کا حریص تھا اور اپنے خسر سے بہت جلتا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے خسر کو دعوت پر بلایا اور اس کے پورے خاندان کو تہ تیغ کر کے ساری جائیداد پر قابض ہو گیا۔ وہ راجہ کہلاتا تھا۔ اس کی عملداری بھمبر کے پورے علاقے میں تھی۔

جب بابر سریر آرائے سلطنت ہوا تو چب چند سلامی کے لیے اس کے دربار میں حاضر ہوا اور اپنی جائیداد کی توثیق کرا لی۔ اس کے بعد وہ مسلمان ہو گیا۔ اس نے اپنا نام شاداب خان رکھا۔ جب ہمایوں تخت پر بیٹھا تو شاداب خان کئی مہمات میں اس کا ہمرکاب رہا۔ آخر قندھار کے ایک شخص پیر ہیبت نے اسے دشمنی میں آ کر قتل کر دیا۔ چب آج تک شاداب خان کو پیر مانتے ہیں اور اس کے مزار پر جو بھمبر کے قریب واقع ہے، بچوں کی "جھنڈ" اتارتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ مزار سورسادی شہید کا ہے۔

چب کے راجے کسی زمانے میں دریائے جہلم کے ساتھ ساتھ کھاری کریالی، منگل اور نوشہرہ پر بھی قابض تھے۔ جب سکھ برسر اقتدار آئے تو انہوں نے گجرات کے گکھڑوں پر فتح پانے کے بعد چبوں پر حملہ کیا لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کے بعد ایک سردار گوجر سنگھ کے لڑکے صاحب سنگھ نے ماہن سنگھ سکرچاکیہ کے ساتھ مل کر منگلا پر حملہ کیا لیکن ناکامی ہوئی۔ آخر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے 1810ء میں گجرات پر قبضہ جمانے کے بعد چونیاں پر حملہ کیا جس کا قلعہ راجہ عمر خان کے پاس تھا۔ وہ بھاگ کر منگلا چلا گیا۔ سکھوں نے اس کا تعاقب کیا۔ عاجز آ کر راجہ عمر خان نے اپنے لڑکے اکبر علی خان کو صلح کے لیے بھیجا لیکن ابھی جواب نہ آیا تھا کہ عمر خان فوت

ہوگیا۔ اس کے بعد مہاراجہ نے اکبر خان کی پیش کش قبول کرلی اور آدھی جائیداد اسے لوٹادی لیکن ابھی چھ ماہ بھی نہ ہوئے تھے کہ اس کا سب کچھ ضبط کرلیا گیا۔ تاہم اس کے دوسرے بیٹے امیر خان کو چار ہزار روپیہ اور اس کے بھتیجے شیر جنگ خان کو تین ہزار روپیہ پنشن دے دی۔ کھاری کریالی کی جاگیر کھڑک سنگھ کے پاس تھی۔ اس نے امیر خان کے چھوٹے بھائی فضل داد خان کو اپنے ہاں تین روپیہ دیہاڑی پر ملازم رکھ لیا اور دس سال بعد دس سواروں کے عوض اسے ایک ہزار پچھتر روپے کا عطیہ دیا۔ جب کشمیر اور جموں مہاراجہ گلاب سنگھ کے حصے آئے تو عطیہ کو جاگیر میں شامل کردیا گیا۔ اس کے علاوہ فضل داد خان کے وارثوں کو مزید عطیے اور جاگیریں دی گئیں۔

چبوں کا ایک ممتاز سردار راجہ سلطان خان تھا۔ اس نے جنگ آزادی میں انگریز کا ساتھ دیا جس کے عوض اسے انعامات اور جاگیریں ملیں۔ چبوں میں سے ہندو خاندان کی اولاد نے بھی انگریز سے عہدے، مناصب اور جاگیرداریاں وصول کیں۔ مردان علی خان نے جنگ آزادی میں انگریز کو تیس سوار دیے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے ابی سینا اور افغان جنگ میں حصہ لیا جس پر اسے سردار بہادر کے خطاب کے علاوہ کھاریاں کی تحصیل میں جاگیر اور ذیلداری ملی۔ اسے چناب کالونی میں نو مربعے بھی دیے گئے۔

مردان علی خان کی وسیع جائیداد اس کے چھ بیٹوں میں تقسیم ہوگئی۔ تاہم انہوں نے انگریز کی فوجی خدمات بجالا کر بہت کچھ پایا۔ ان میں سے تیسرا بیٹا سلطان عالم خان کسی زمانے میں وٹرنری کالج لاہور کا ہاؤس سرجن بھی رہا ہے۔

انگریز مؤرخوں کا بیان ہے کہ مسلمان چبوں کے برعکس ہندو چب انگریز کے لیے بہت زیادہ پریشانی کا موجب تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں وہ ڈاکہ اور رہزنی کے لیے بدنام تھے۔ وہ جموں کے قریب پہاڑیوں پر رہتے تھے اور جب موقعہ ملتا نیچے اتر کر گجرات تک مار دھاڑ کرتے۔ وہ انگریزوں کی بستیوں میں بھی لوٹ مار مچاتے۔ آخر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ان کی سرکوبی کی۔

چب راجپوتوں کی ایک اور شاخ کا مورث اعلیٰ راجہ سلطان خان تھا۔ اس نے ڈوگروں کی ایک فوج مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حوالے کی اور اسے اکسایا کہ کشمیر پر قبضہ کرلے لیکن جب دھیان سنگھ اور گلاب سنگھ نے دیکھا کہ سلطان خان بے حد اثر و رسوخ کا مالک ہوتا جارہا ہے تو انہوں نے اسے جموں بلایا اور وہاں نماز کی حالت میں اسے اپنے نوکروں سے قتل کرادیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو یہ اطلاع ملی تو وہ غصے سے لال پیلا ہوگیا۔ اس نے سلطان خان کے بیٹے فیض طالب کو انتقاماً "نولاکھ کی سرداری بخش دی لیکن جب رنجیت سنگھ مرگیا تو راجہ گلاب سنگھ نے یہ جائیداد پہلے تو چھین لی اس کے بعد تھوڑی کردی۔ ادھر جموں و کشمیر پر مہاراجہ گلاب سنگھ نے قبضہ کر رکھا تھا۔ انگریزوں نے پہاڑی سرداروں کی دل جوئی کا فیصلہ کیا۔ 1817ء میں سرہنری لارنس نے

سکھوں سے مشورہ کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ جو پہاڑی سردار انگریزی راج کے تحت رہنا چاہیں ان کو 42,800 روپے کی دائمی پنشن دی جائے۔ اس کے مقابلے میں سوجان پور (پٹھان کوٹ) اور دریائے بیاس اور چکی کے درمیان کا علاقہ انگریز کے حوالے کردیا جائے۔ راجہ فیض طالب نے، جس کو ہنری لارنس "بھمبر والا" کہتا تھا دس ہزار روپیہ پنشن کا حقدار ہوا۔ فیض طالب کو یہ شرط منظور تو نہ تھی تاہم اس نے شاہدرہ (لاہور) میں رہائش اختیار کرلی۔ اس کی اولاد نے انگریزی فوج کی "شاندار" خدمات سرانجام دیں جن کے صلہ میں وہ اعلیٰ عہدوں پر متمکن ہوتی رہی۔

باب 26

مؤکل سردار

لاہور کے علاقہ میں بڑے زمینداروں کا ایک ایسا خاندان بھی آباد ہے جس کے کچھ افراد مسلمان ہیں اور کچھ سکھ، لیکن دونوں "مؤکل" کہلاتے ہیں۔ انگریزوں نے نہ صرف ان کو خطابات سے نوازا بلکہ ان کی سکھوں کے زمانہ کی جاگیر کو بحال کیا اور فوج میں بھرتی کر کے ان کو اپنے مخصوص مفاد کی تقویت کے لیے استعمال کیا۔

مؤکل دراصل سندھو جاٹ ہیں جن کو رنجیت سنگھ کے زمانہ میں خاصا اقتدار حاصل ہوا۔ تاہم سکھ ان کو دیر تک اپنانے سے گریز کرتے رہے۔ انہوں نے جو کچھ حاصل کیا انگریز کی اطاعت اور فرماں برداری کے طفیل کیا۔ اس خاندان کا بانی ایک جاٹ سوندھا سنگھ تھا جس کے سات بیٹے تھے۔ ان میں سے صرف دو کو انگریز کی نگاہ میں نمایاں ہونے کا موقع ملا۔ سوندھا سنگھ نے اپنی بیٹی پاک پٹن کے ایک جاگیردار سردار لال سنگھ سے بیاہ دی جس نے اپنے نسبتی بھائیوں کو سکھ فوج میں بھرتی کرا دیا۔ ان میں سے جوندھ سنگھ نے دیوان محکم چند کی کمان میں افغان وزیر کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا۔ رنجیت سنگھ ان بھائیوں کی جرأت و بہادری سے ایسا متاثر ہوا کہ ان میں سے بعض کو جاگیریں دے دیں اور ایک کو ضلع گجرات میں پانچ گاؤں بخش دیے۔ اس خاندان کے افراد اسی طرح سکھوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف جنگ آزما رہے اور جاگیروں اور انعامات سے سرفراز ہوتے رہے۔ حتیٰ کہ 1829ء میں ان کے ایک فرد چھتر سنگھ نے دین اسلام قبول کر لیا اور اپنا نام فتح دین رکھا۔ اس کی مسلمان بیوی سے تین بیٹے پیدا ہوئے۔ خاندان کے دوسرے افراد بدستور سکھ رہے اور انہوں نے راجہ لال سنگھ کے زمانہ میں نہ صرف اپنی چھینی ہوئی جاگیریں واپس لیں بلکہ فوجی خدمات کے عوض نئی بھی حاصل کیں۔ 1861ء میں ان کے ایک فرد مان سنگھ کو پولیس کی ملازمت سبکدوش ہونے کے بعد موکل کے قریب 38 دیہات کا ذیل دار یا آنریری پولیس مجسٹریٹ بنا دیا گیا۔ 1862ء میں اسے 720 ایکڑ زمین چونیاں میں دی گئی۔ اس کے بعد اس کے دو بیٹے پرتاپ سنگھ اور لابھ سنگھ مسلمان ہو گئے۔ اول الذکر لاہور اور حصار میں دو ہزار دو سو ایکڑ کا مالک تھا۔

اس کے علاوہ چناب کالونی میں اسے 560 ایکڑ زمین عطیہ کے طور پر ملی۔ اس نے اپنا نام بشیر احمد خان رکھ لیا تھا۔ وہ آب پاشی کے محکمہ سے دو سو روپے ماہانہ پنشن پر ریٹائر ہوا۔ اس نے زراعت پر کچھ کتابیں بھی لکھی

ہیں۔ لابھ سنگھ کا اسلامی نام محمد عمر تھا۔ وہ بھی ذیلدار رہا ہے۔ ان کے بھائی گودڑ سنگھ کو رکھ منڈی میں پچاس ایکڑ زمین دی گئی۔ وہ جلو کی چونیاں کا ذیلدار تھا۔ مان سنگھ کی اولاد میں سے تیجا سنگھ بھی مسلمان ہو گیا۔ اس کا نام عبدالرحمان تھا۔ اسے خان بہادر کا خطاب ملا۔ وہ موکل اور دوسرے دیہات میں 268 ایکڑ زمین کا مالک تھا۔ اس کا بڑا لڑکا جمیل اللہ محکمہ آب پاشی میں ملازم تھا اور تیسرا لڑکا فقیر اللہ نائب تحصیلدار تھا۔ اسی طرح مقدم سنگھ بھی رسالدار رہا ہے اور ریٹائر ہونے پر اسے سلطان کی میں ایک سو ایکڑ زمین دی گئی۔ غرض یہ خاندان انگریز کی کاسہ لیسی کے لیے ممتاز رہا اور اس کے عوض اس کے افراد نے بے شمار اراضی حاصل کی جس کی ملکیت اب تک چلی آ رہی ہے۔

باب 27

سَدُّوزئی نواب

لاہور اور ملتان کے جاگیرداروں میں نواب مظفر خان کو امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس خاندان کے افراد کابل اور قندھار میں دہلی کے مغل بادشاہوں کے گورنر رہے ہیں۔ اس خاندان کا بانی سَدّو خان تھا' جو سدوزئی قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی اولاد میں سے شاہ حسین ایرانی بادشاہوں سے شکست کھا کر ہندوستان چلا آیا۔ یہاں اسے سیالکوٹ میں جاگیر ملی اور دارا شکوہ اور اورنگ زیب کے ساتھ مل کر قندھار اور دکن وغیرہ کی مہمات میں شریک ہوتا رہا۔ اس کے بیٹے بھی مغلوں کی خدمت کرتے اور انعام واکرام پاتے رہے۔ انہوں نے سکھوں اور مرہٹوں کا مقابلہ بھی کیا تاہم اس خاندان کے ایک فرد مظفر خان نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا جس سے خوش ہو کر مہاراجہ نے اسے خلعت دی۔ تاہم سکھوں کا دباؤ برابر بڑھتا رہا جس سے تنگ آکر مظفر خان حج کے لیے مکہ معظمہ چلا گیا۔ وہاں سے 14 ماہ بعد واپس آیا تو اپنے آپ کو انگریز کی پناہ میں دینے کے لیے گورنر جنرل سے خط وکتابت کرتا رہا۔ اتنے میں رنجیت سنگھ نے ایک مرتبہ پھر ملتان پر حملہ کیا۔ مظفر خان نے اس دفعہ بھی اسے کچھ دے دلا کر واپس کر دیا۔ لیکن 1816ء میں سکھوں نے ملتان پر پھر چڑھائی کی۔ پہلے تو وہ رشوت لے کر واپس چلے گئے لیکن اگلے سال کھڑک سنگھ نے باقاعدہ حملہ کیا جس میں مظفر خان اور اس کے پانچوں بچے مارے گئے۔ اس کے بعد سکھوں نے اس کے بیٹے سرفراز خان کو شرق پور اور نولکھا میں جاگیر دی۔ اس کے جانشین لاہور' کپور تھلہ اور بہاولپور میں مختلف عہدوں پر متمکن رہے ہیں۔ سکھوں کی عطا کی ہوئی جاگیروں کے علاوہ انگریزوں نے بھی ان کی خدمات کے عوض پنشن' انعام اور معافیاں دیں۔

باب 28

پنجاب کے کلال شیخ

پنجاب میں ایک ایسا جاگیردار خاندان بھی ہے جس کا سربراہ ہوشیار پور کے ایک معمولی سکھ کلال کا منشی تھا لیکن اس کی اولاد نے سکھوں اور انگریزوں سے ساز باز کر کے دوآبہ جالندھر اور ریاست جموں وکشمیر کے مسلمانوں پر اتنے ہولناک مظالم ڈھائے کہ انسان آج بھی کانپ اٹھتا ہے۔ اسی لیے یہ خاندان انگریزوں کا منظور نظر رہا اور انہوں نے اس کے تمام افراد کو نہ صرف لاہور' پاک پٹن' منٹگمری اور لائل پور میں ہزاروں ایکڑ زمین انعام اور جاگیر کے طور پر بخش دی بلکہ اعلیٰ سرکاری عہدوں پر بھی متمکن کیا۔

اس خاندان کے دو افراد جو دراصل باپ بیٹا تھے' شیخ کہلاتے ہیں۔ شیخ اجالا دراصل ایک کلال تھا جس نے ہوشیار پور کے سردار بھوپ سنگھ کے پاس منشی کے طور پر ملازمت اختیار کر رکھی تھی۔ اس کے لڑکے غلام محی الدین پر دیوان موتی رام (ولد جنرل حکم چند) کی نظر پڑی تو اس نے اسے اپنے بیٹے شیو دیال کے پاس نوکر کرا دیا۔ غلام محی الدین نے ان لوگوں کے پاس رہ کر پرزے نکالے اور ہندوؤں نے بھی اسے اپنے مفاد کے لیے پوری طرح استعمال کیا۔

1823ء میں جب کابلی پٹھانوں نے سکھوں پر چڑھائی کی تو رنجیت سنگھ نے ان کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر سوچا کہ کسی طرح بات چیت کے ذریعے ان سے جان چھڑائی جائے۔

اس مقصد کے لیے نگاہ انتخاب غلام محی الدین پر پڑی۔ چنانچہ اس نے کابلیوں کے ایک پیر کے ذریعے یہ کام بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دیا۔

1827ء میں شیو دیال کے بھائی کرپا رام کو ریاست جموں وکشمیر کا گورنر بنایا گا تو وہ اپنے ہمراہ شیخ غلام محی الدین کو بھی لے گیا۔ ریاست میں شیخ کو کھل کھیلنے کا موقع ملا۔

وہ مالیہ وصول کرنے پر مامور تھا۔ اس نے غریب اور پسماندہ مسلمانوں سے روپیہ بٹورنے کے لیے ایسے ایسے ظلم ڈھائے کہ حکومت لاہور بھی پریشان ہو گئی۔ اسے دو دفعہ واپس بلا کر قید اور جرمانے کی سزا بھی دی لیکن وہ باز نہ آیا۔ آخر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے حکم دیا کہ ہوشیار پور میں اس کی جائیداد ضبط کر لی جائے۔ اس کے قبضہ سے ساڑھے نو لاکھ روپے نقد نکلے۔ وہ قسمیں کھاتا رہا کہ یہ روپیہ اس کے باپ نے اپنی ملازمت کے دوران جمع کیا تھا لیکن رنجیت سنگھ جانتا تھا کہ اس کے باپ نے ایک لاکھ روپیہ بھی یکجا پڑا ہوا نہیں دیکھا۔ چنانچہ غلام محی

الدین کو بیک بنی دو گوش ملازمت سے نکال دیا لیکن کچھ عرصے بعد نونہال سنگھ نے اسے دوبارہ رکھ لیا اور 1839ء میں اسے دو آبہ جالندھر کا حاکم (گورنر) بنا دیا اور اگلے سال ہی اسے جنرل ونتورا کے ساتھ منڈی کے راجپوتوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ ابھی وہ لڑائی میں مصروف تھا کہ اس نے نونہال سنگھ کی اچانک موت کی خبر سنی۔ چنانچہ وہ لڑائی ادھوری چھوڑ کر لاہور پہنچا اور یہاں نونہال سنگھ کی ماں (مائی چند کور) کی حمایت پر کمربستہ رہا۔ تاہم جب شیر سنگھ تخت پر بیٹھا تو اس نے غلام محی الدین کو معاف کر دیا اور اسے گورنر کشمیر کے عہدے پر متمکن کیا۔

شیخ غلام محی الدین نے گورنر کشمیر کی حیثیت سے اور اس کے بیٹے امام الدین خان نے گورنر جالندھر کی حیثیت سے مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے اس کا تذکرہ ان علاقوں میں آج بھی نفرت و حقارت سے کیا جاتا ہے۔

تاہم سکھوں کے نزدیک یہ دونوں باپ بیٹا معزز تھے۔ اس لیے ان پر ہمیشہ انعام و اکرام کی بارش ہوتی رہی۔ شیخ غلام محی الدین ہی تھا جس نے مظفر آباد کے حاکم سلطان زبردست خان کو عین نماز کی حالت میں قتل کر دیا اور اس کی جاگیر غصب کر لی۔

1845ء میں جب انگریزوں نے پنجاب میں قدم پسارے تو غلام محی الدین نے ان سے وفاداری کا اظہار کیا اور صلح کی بات چیت کرنی چاہی لیکن اس کی تجاویز کو مسترد کر دیا گیا جس کے فوراً ہی بعد (غالباً زہر خوری کے باعث) وہ ہلاک ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے لڑکے امام الدین خان نے کشمیر کی باگ ڈور سنبھالی۔ جب مہاراجہ گلاب سنگھ نے 16 مارچ 1846ء کو کشمیر کا سودا کیا تو امام الدین ہی وہاں کا گورنر تھا۔ لاہور میں اس سودے کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے ایک حریف راجہ لال سنگھ نے امام الدین کو خفیہ پیغام بھیجا کہ مہاراجہ کی مخالفت پر کمربستہ رہے۔ یہ کام اس نے بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا اور کشمیر کے مسلمانوں کا خون پی پی کر روپیہ جمع کرتا رہا۔ حتیٰ کہ مشہور ہو گیا کہ اس کے پاس دو کروڑ روپیہ ہے۔

دراصل امام الدین کا خیال تھا کہ وہ انگریز کو رشوت دے کر کشمیر کا وائسرائے بن جائے گا۔ اسی لیے وہ راجہ لال سنگھ کی ہدایات پر بھی عمل کرتا رہا۔ اس نے مہاراجہ گلاب سنگھ کی فوجوں کو رشوت دے کر اپنے ساتھ ملا لیا اور راجوری کے راجہ رحیم اللہ خان کی امداد سے نہ صرف کشمیر میں اپنے پاؤں مضبوط کر لیے بلکہ انگریزوں کے مقابلہ کے لیے بھی تیاری کرتا رہا۔ آخر جب اسے محسوس ہوا کہ انگریزی سپاہ کا مقابلہ کرنا اس کے بس کی بات نہیں تو اس نے تھانہ کے مقام پر کرنل لارنس کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے ساتھ ہی راجہ لال سنگھ کے خفیہ خطوط بھی دکھائے اور کہا کہ میں تو اس کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا ورنہ انگریزوں سے میری کیا دشمنی ہے۔ انگریز نے انہی خطوط کی بنا پر راجہ لال سنگھ کو وزارت سے ہٹا کر جلاوطنی کی سزا دے دی۔

اس کے بعد امام الدین انگریزی فوج کے ساتھ مل گیا اور ملتان کی مہم میں شریک ہوا۔ انگریز نے خوش ہو

کر اسے "نواب" کا خطاب دیا اور 11600 روپے کی پنشن کے علاوہ 8400 روپے کی جاگیر بھی عطا کی۔

امام الدین کے بعد اس کی اولاد پر انعام و اکرام کی بارش ہوئی۔ غلام محبوب سبحانی کو پانچ ہزار روپے کی موروثی جاگیر ملی چونکہ اس کا کوئی بیٹا نہ تھا اس لیے پنشن کا روپیہ بیٹی کو ملتا رہا۔ جاگیر اس کے بھتیجے شیخ ناصر الدین کو ملی جو تین برس تک ریاست بہاولپور کا وزیر بھی رہا ہے۔ اس کا باپ فیروز الدین تحصیلدار اور جج کے عہدے سنبھالنے کے بعد وزیر بنا۔ نواب امام الدین خان کا ایک اور بھتیجا ساندے خان تھا۔ وہ 1873ء میں لاہور کا آنریری مجسٹریٹ رہا۔ 1885ء میں اسے تحصیل پاک پتن ساہیوال میں دو ہزار ایکڑ زمین دی گئی۔ اس کے بیٹے شیخ محمد حسین کو لائل پور میں چھ مربع زمین ملی۔

باب 29

مزاری سردار

دریائے سندھ کی زرخیز زمینوں پر قابض ہونے کے لیے مزاری اپنے تمام ہمسایہ قبیلوں سے لڑتے جھگڑتے رہے اور کبھی جیتے کبھی ہارے۔ آخر جمال دوم کے زمانہ میں سندھ کے کنارے میدان میں اتر کر آباد ہونے لگے۔ اس وقت یہ علاقہ نہر قبیلہ کے پاس تھا۔ اس نے مزاریوں کو راجن پور اور دریائے سندھ کے درمیان کا علاقہ دے دیا جو آج بھی "جمال واہ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں جمال خان نے ایک نہر بھی کھودی تھی۔ رفتہ رفتہ مزاریوں نے دوسرے قبائل، خصوصاً چانڈیا اور بگٹی سے زمین ہتھیائی اور اپنی عملداری بہت وسیع کرلی۔

بگٹی قبیلہ سے مزاریوں نے بے شمار لڑائیاں لڑیں۔ ایک موقع پر مزاری مویشی چرا کر لے جارہے تھے کہ ان کے پانچ ساتھی ایک پہاڑی پر بیٹھ کر جوا کھیلنے لگے۔ وہ اپنے کھیل میں اتنے محو تھے کہ بگٹیوں نے ان کو اچانک آلیا اور قتل کردیا۔ جب اس کی اطلاع میر جمال خان کو پہنچی تو اس نے قسم کھائی کہ اگر آئندہ ایک بھی مزاری جوا کھیلتا دیکھا گیا تو اسے موت کی سزا دی جائے گی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد اس نے اپنے بیٹے مٹھا خان کو جوا کھیلتے دیکھا۔ مٹھا خان نے باپ کو دیکھتے ہی دیوار پھلانگ کر بھاگنا چاہا، لیکن جمال خان نے ایسا تاک کر تیر چلایا کہ اس کے بیٹے کی ران کو چھیدتا چلا گیا۔ جب مزاریوں نے دیکھا کہ ان کا سردار جوئے کے بارے میں اتنا سخت ہے تو انہوں نے جوا کھیلنا بند کردیا۔

مزاریوں اور دریشکوں کی لڑائیاں بھی قابل ذکر ہیں۔ دونوں کی دشمنی آج تک جاری ہے۔ تاہم لڑائی اب میدان میں نہیں عدالت میں ہوتی ہے۔ دشمنی کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ مزاری اپنی بھیڑ بکریاں گنڈاری کی پہاڑیوں پر چرایا کرتے تھے۔ دریشک آتے اور ان کے جانور اٹھا کر لے جاتے۔ جمال خان نے ایک دفعہ ان پر چڑھائی کی اور کم سے کم پندرہ دریشک مار ڈالے۔ اس کے بعد دونوں قبائل ایک دوسرے پر حملے کرتے رہے جن میں جمال خان کی بیوی ماری گئی اور ماں بھی زخمی ہوگئی۔ مزاری آج تک کہتے ہیں کہ دریشکوں نے ان کی بے عزتی کی۔ دریشکوں کا بیان ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ عورتوں پر حملہ اتفاقیہ تھا۔

میر جمال خان کے بعد اس کا بیٹا میر مٹھا خان قبیلہ کا سردار منتخب ہوا۔ اس وقت بھی ہمسایہ قبیلوں کے ساتھ مزاریوں کی جنگ برابر جاری رہی۔ آخر گورچانیوں نے اپنی ایک لڑکی جمال خان کے پوتے مصطفیٰ خان سے بیاہ دی جس کے بعد قدرے امن ہوا۔

اب تک مزاری آزاد قبیلہ کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ جب احمد شاہ درانی نے حملہ کیا تو اس نے ہرنند جل کا علاقہ بروہی قبیلہ کے سردار ناصر خان کو دے دیا۔ ناصر خان نے مزاریوں کو مار بھگایا اور کشمور میں قلعہ بنا کر پورے میدانی علاقہ پر قابض ہوگئے۔ مزاری پہاڑیوں میں جا کر چھپ گئے لیکن بروہیوں نے ان کا پیچھا کیا اور ان کے سردار میر گل شیر خان کو قتل کردیا۔ اس کے بعد مزاریوں کی طاقت کمزور ہوگئی۔ تاہم میر شاہ علی نے سب کو اکٹھا کرکے کشمور پر حملہ کیا۔

ادھر چانڈیا ابھی تک دریائے سندھ کے دامن میں دندنا رہے تھے۔ مزاریوں نے ان سے صلح کرلی اور دونوں بروہیوں کے مشترک دشمن بن گئے، لیکن سندھ کے کنارے کی زمین کچھ ایسی زرخیز تھی کہ قبائلی جنگیں ختم ہونے کو نہ آتی تھیں۔ میر شاہ علی نے فیصلہ کن جنگ کرنے کا تہیہ کرلیا۔ اس نے راتوں رات کشتیوں کے ذریعے دریا کے پار اپنے سینکڑوں آدمی اتارے اور چانڈیوں پر یکلخت ہلہ بول دیا۔ بے شمار چانڈیا مارے گئے۔ مزاریوں نے ایک ایک گھر کو لوٹا اور پورے علاقہ پر قبضہ جمالیا۔ اس علاقے کو آج بھی "چنڈکو" کہتے ہیں۔ ادھر قلات کا ناصر خان مزاری علاقہ پر قابض ہونے کے لیے پر تولنے لگا۔ اس کے ساتھ بگٹی قبیلہ کے لوگ بھی مل گئے۔ انہوں نے راجن پور پر حملہ کیا اور بیالیس مزاری قتل کرنے کے بعد ان کے مال مویشی اٹھا کر لے گئے۔ بروہیوں نے عمر کوٹ میں ایک قلعہ بنا رکھا تھا۔ مزاریوں نے پانچ سو آدمیوں کا ایک لشکر تیار کرکے اس پر حملہ کر دیا اور بروہیوں کے سرداروں کو مار ڈالا۔ اس کے بعد خان قلات کو مزاریوں کی آزادی میں دخل دینے کی جرأت نہ ہوئی۔ تاہم میر جمال خان نے بہتری اسی میں سمجھی کہ کسی طاقتور سردار سے راہ و رسم رکھے۔ چنانچہ اس نے سندھ کے تالپوری امیر سے سمجھوتہ کرلیا۔ وہ بنفس نفیس خیرپور کے دربار میں حاضر ہوا اور مزاریوں کی تمام مملوکہ اراضی کی مالگزاری پیش کردی۔ میر تالپور نے رسمی طور پر تمام اراضی کی ملکیت کے حقوق مزاریوں کو عطا کردیے۔

یہ واقعہ 1791ء کا ہے۔ اس سمجھوتہ کے تحت مزاریوں کی عملداری اب بھی تسلیم کی جاتی ہے۔

بروہی بھاگ گئے تو مزاریوں نے بگٹیوں کے علاقہ پر حملہ کردیا اور ایک ندی کے کنارے فتح پانے کے بعد بے شمار مال غنیمت لوٹا۔ لیکن ابھی وہ مال لے کر واپس جارہے تھے کہ بگٹیوں نے عقب سے ان پر حملہ کردیا اور رات کی تاریکی میں بے شمار مزاری موت کے گھاٹ اتارے۔ کہتے ہیں کہ ایک ٹکارانی مزاری چھاچھر نام نے منت مانی کہ اگر یہ رات دن سے بدل جائے تو وہ سندھ کے ایک پیر رندانی کے مزار پر کالا بیل چڑھائے گا۔ روایت ہے کہ رات فوراً دن سے بدل گئی اور مزاریوں نے بگٹیوں پر حملہ کرکے ان کو بھگا دیا۔ اس کے بعد بھی بروہیوں اور دریشکوں سے مزاریوں کی لڑائی جاری رہی جس میں انجام کار فتح مزاریوں کی ہوئی۔

1819ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ڈیرہ غازی خان کا علاقہ انتظامی لحاظ سے ریاست بہاولپور میں شامل کر دیا۔ 1827ء میں ہرنند جل کا علاقہ بھی خان قلات سے چھین لیا گیا جس کے بعد سکھوں کی دھاک بیٹھ گئی۔ اس

علاقہ پر دیوان ساون مل کی حکومت تھی۔ اس کے نزدیک مزاری چونکہ ابھی تک مار دھاڑ میں مصروف تھے اس لیے وہ سات ہزار کی فوج لے کر ان پر چڑھ دوڑا اور ان کے تمام مال مویشی چھین کر ان کو پہاڑیوں میں مار بھگایا۔ تاہم وہ جلد ہی اکٹھے ہو کر مٹھن کوٹ پر حملہ آور ہوئے لیکن ساون مل نے یہاں سے بھی ان کو بھگا کر خیرپور میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ آخر لغاریوں کے سردار رحیم خان کے ذریعے سکھوں اور مزاریوں کی صلح ہو گئی۔ مزاریوں کو ان کی جاگیریں لوٹا دی گئیں۔ اس غرض کے لیے دیوان نے ملتان میں ایک دربار منعقد کیا جس میں بہرام خان خود حاضر ہوا اور اسے خلعت دی گئی۔ یہ 34-1833ء کا واقعہ ہے۔

1837ء میں بہرام خان فوت ہو گیا تو اس کے بیٹے دوست علی خان کے زمانے میں مزاریوں نے پھر سر اٹھایا لیکن سکھوں نے ان کو پھر سندھ کی جانب بھگا دیا۔ اتنے میں دیوان ساون مل مارا گیا۔ اس کے لڑکے مول راج کو چونکہ حامیوں کی ضرورت تھی اس نے مزاریوں کو معاف کر دیا۔

اب الحاقِ پنجاب کا زمانہ آیا۔ دوست علی خان بری عادتوں میں پڑ گیا۔ اس لیے قبیلہ کا انتظام اس کے چھوٹے بھائی امام بخش خاں نے سنبھال رکھا تھا۔ اس نے مزاریوں کو ایک بااخلاق اور باضابطہ قبیلہ بنانے کی پوری کوشش کی اور انگریزوں کا ممد و معاون رہا۔ انقلاب 1857ء میں اس نے استعمار پسندوں کی جو خدمت کی اس کے صلہ میں اسے آنریری مجسٹریٹ بنا دیا گیا۔ جس زمانہ میں رابرٹ سنڈیمن اس علاقے کا ڈپٹی کمشنر تھا مزاریوں کو اسی شخص نے جذبۂ جہاد سے محروم کیا۔

1874ء سے 1877ء تک انگریز خان قلات سے گفت و شنید کرتے رہے۔ امام بخش نے یہاں بھی انگریز کی مدد کی اور بات چیت کو پروان چڑھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مزاری سردار پر خطابات کی بارش ہونے لگی۔ پہلے نواب' پھر سر' پھر صوبائی درباری اور پھر پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کا رکن نواب سر امام بخش خان کے بھائی اور ان کے بیٹے بڑھتے اور پڑپوتے قیام پاکستان تک انگریزی راج کی مسکراہٹوں میں پروان چڑھتے رہے۔ ان کو نہ صرف اعزازات و خطابات ملے بلکہ وسیع اراضی پر بھی وہ بدستور قابض ہیں۔ ان کا شمار پاکستان کے بڑے زمینداروں میں ہوتا ہے۔

باب 30

لغاری تمن دار

ڈیرہ غازی خان کے تمن داروں کی ایک اور شاخ لغاری کہلاتی ہے۔ یہ لوگ بھی اپنے بلوچی بھائیوں کی طرح سولہویں صدی کے اوائل میں آکر اس جگہ آباد ہوئے۔ جب ان کا ایک سردار میر چاکر ہمایوں بادشاہ کے ساتھ جاملا تو یہ بھی اس کے ساتھ تھے۔ ہمایوں نے شیر شاہ سوری کے جانشینوں کے خلاف فوج کشی کی تھی۔ لغاریوں نے اس مہم میں اس کا پورا پورا ساتھ دیا۔

آخری عمر میں میر چاکر منٹگمری کے قریب ست گھرہ کے مقام پر آباد ہوا جہاں اس کا مزار آج بھی موجود ہے۔ تاہم لغاری اپنے سردار میر رند خان کے ہمراہ وادیٔ سندھ میں واپس چلے گئے جہاں اس وقت غازی خان ڈوڈئی نے اپنی عملداری قائم کر رکھی تھی۔ لغاریوں نے اس سے یہ علاقہ واپس چھین لیا اور احمدانی بلوچیوں کو مار بھگایا جو اب تک کہیں کہیں موجود ہیں۔ رند خان چوٹی کے مقام پر فوت ہوا اور وہیں اس کا مزار ہے۔

اٹھارہویں صدی میں لغاریوں کی ایک شاخ علیحدہ ہو کر تالپور (سندھ) چلی گئی۔ ان کا سردار شاہداد خان تھا جس نے شمالی سندھ کے کلہوڑا سردار غلام شاہ کے پاس پناہ لی۔ 1772ء میں تالپوری لغاریوں نے کلہوڑوں کا خاتمہ کر دیا اور اس علاقے کے بلا شرکت غیرے مالک بن گئے۔

لغاریوں کی ایک شاخ برخان کہلاتی ہے اور موجودہ بلوچستان میں آباد ہے۔ جب دُرّانیوں کا خاتمہ ہوا اور ڈیرہ غازی خان پر سکھوں نے قبضہ کیا تو ایک لغاری سردار محمد خان بھاگ کر لغاری برخان میں چلا گیا جہاں اس کے ہاں جمال خان پیدا ہوا۔ لغاری جلد ہی سکھوں کے حلیف بن گئے اور ساون مل کو ساتھ ملا کر اپنے پرانے حریفوں گورچانیوں اور کھوسوں سے انتقام لینے میں کامیاب رہے۔ چھاتا خان گورچانی نے اپنے بھتیجے سے تمن داری چھین رکھی تھی لیکن بھتیجا ہوشیار نکلا۔ اس نے لغاریوں کی امداد سے اچانک چھاتا خان پر حملہ کیا اور اسے دیوان ساون مل کے حوالے کر کے اپنا منصب واپس لے لیا۔ اس کے بعد دشمنی کی آگ کچھ دیر فرو رہی لیکن پھر بھڑک اٹھی۔ رحیم خان لغاری کے ایک بیٹے کو گورچانیوں نے بہاولپور میں پہنچ کر قتل کر دیا۔ رحیم خان پہلے سردار کا بھتیجا تھا اس نے محمد خان کی موت کے بعد تمن داری پر قبضہ کر رکھا تھا لیکن مزاریوں کی امداد سے اسے بہاولپور بھگا دیا گیا جہاں نواب نے اسے صادق آباد کی تحصیل میں رحیم آباد کے مقام پر ایک جاگیر دے دی۔

1848ء میں جب ایڈورڈس نے ڈیرہ غازی خان پر حملہ کیا تو لغاریوں نے سکھوں کا ساتھ دیا لیکن کھوسے اور گورچانی انگریز کے حامی بن گئے۔ جلال خان لغاری سندھ ساگر دو آب میں مُولراج سے جاملا اور پانسو قبائلیوں کی امداد اسے بہم پہنچائی لیکن ایڈورڈس نے ڈیرہ غازی خان پر قبضہ کر لیا اور کھوسوں نے لغاریوں کو

شکست دے دی۔ اس موقع پر ایک لغاری سردار جلال خان نے 80 آدمی لے کر انگریزوں کی اطاعت کا اعلان کر دیا لیکن کھوسوں کی موجودگی میں ان کو وہ عزت نہ مل سکی جو وہ چاہتے تھے۔ تاہم جلال خان نہروں کا ٹھیکیدار بن گیا۔ اس نے پٹھان قبائلیوں کو مزدوروں کے طور پر بھرتی کر کے بہت سی نہریں کھودیں اور خوب روپیہ کمایا۔ اسے مجسٹریٹ کے اختیارات بھی دے دیے گئے لیکن نہروں کے معاملہ میں وہ بدمعاملہ ہی ثابت ہوا۔ اس لیے اس کے یہ اختیارات چھین لیے گئے۔ تاہم اس نے جوش و خروش کے ساتھ انگریز کی خدمت کی اور 1875ء میں سر رابرٹ سنڈیمن کے ساتھ قلات کی مہم پر بھی گیا جس سے خوش ہو کر انگریز نے نہ صرف مجسٹریٹ کے اختیارات لوٹا دیے بلکہ اسے نواب کا خطاب بھی دیا۔ 1881ء میں اس نے حج کر لیا لیکن ابھی اپنے گاؤں چوٹی واپس نہیں پہنچا تھا کہ ڈیرہ غازی خاں ہی میں فوت ہو گیا۔

نواب جلال خان کے بعد محمد خان اور پھر جمال خان نے جاگیر کے انتظام سنبھالے۔ ورثا میں جھگڑا اٹھا تو سرداروں کی ایک کانفرنس بلائی گئی جس میں سردار بہرام خان' سردار جلاب خان' اور خان بہادر جن وڈا خان شامل تھے۔ انہوں نے دین محمد کے حق میں فیصلہ دیا۔ جاگیر پر اس وقت تک بے شمار قرضہ ہو گیا تھا۔ دین محمد خان لغاری نے ڈپٹی کمشنر کی نگرانی میں تمام بقائے صاف کیے جس کے بعد اس کے اعزازات میں خاصا اضافہ ہوا۔ رفتہ رفتہ اس خاندان کو انعاموں' پنشنوں اور معاوضوں کے علاوہ کئی دیہات کی جاگیر بھی ملی۔ سردار جمال خان کے زمانے تک آمدنی کا اندازہ پینسٹھ ہزار روپیہ تھا لیکن اس کے بعد اس میں بہت سا اضافہ ہوا۔

مزاریوں اور لغاریوں کے علاوہ جن قبائلی بلوچی سرداروں کو ڈیرہ غازی خان کے علاقہ میں (جو انگریز کے زمانہ میں تالپور' خیرپور اور قلات تک وسیع تھا) جاگیریں ملی ہوئی تھیں۔ ان میں سیرائی کلہوڑا' کھوسہ' دریشک' گورچانی' سوری' لوند' قیصرانی' لوند ٹپی' سدوزئی' ختکانی' تونسوی اور میرانی شامل ہیں۔ سیرائی دراصل صحرا ختکانی سے نکلا ہے۔ یہ لوگ چونکہ صحرائے سندھ میں آباد تھے اس لیے صحرائی کہلائے جو بگڑ کر سیرائی بن گیا۔ سیرائی حضرت عباسؓ کی اولاد کہلاتے ہیں اور کلہوڑا سرداروں سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں۔ جب احمد شاہ درانی نے ٹھٹھہ کے علاقہ پر قبضہ کیا تو صحرائی سردار نور محمد نے اپنی وفاداری کا اظہار کیا جس پر احمد شاہ نے اسے شاہ نواز کا خطاب دیا جو ورثہ میں چلتا جا رہا ہے۔ اسی نور محمد کے لڑکے غلام شاہ کے زمانہ میں تالپور لغاری شہداد خان بھاگ کر حیدر آباد آیا تھا اور تمام کلہوڑوں نے اس کی آؤ بھگت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا تھا بلکہ اسے جاگیر بھی دی تھی۔ شہداد کے بعد اس کا بیٹا میر بہرام تالپوری سردار بنا اور اسے میاں غلام شاہ نے اپنا وزیر مقرر کیا۔ اسی بلوچی کے طفیل میاں غلام شاہ (اس کی اپنی زبان میں) کچھ سے کالا باغ تک اپنی سلطنت وسیع کرنے میں کامیاب رہا۔ سکھوں اور انگریزوں نے شاہ سیرائی کے خاندان کو بہت نوازا اور بے شمار جاگیریں دیں۔ یوں تو یہ لوگ شیعہ ہیں لیکن ان کی بعض عادات و خصائل سکھوں سے ملتی جلتی تھیں۔ مثلاً وہ نہ مونچھیں چھوٹی کراتے ہیں نہ بال کٹواتے تھے اور سر پر جوڑا باندھ چھوڑتے تھے۔ ان میں سے جان محمد خان اور لطف محمد خان صوبائی درباری تھے۔ ان کے جانشیں خیرپور ریاست میں آباد ہو گئے۔ یہ لوگ میاں صاحب کہلاتے ہیں اور کسی کی آمد

پر بھی اٹھ کھڑے نہیں ہوتے۔ یہ میاں صاحبان بھی دراصل پیری مریدی کے طفیل جاگیردار ہیں۔

کھوسے بلوچی قبیلہ کی شاخ ہوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے پاس سندھ میں بے شمار زمینیں تھیں۔ اب وہ سکھر اور جیکب آباد میں آباد ہیں۔ ان کی ایک شاخ ابھی تک ڈیرہ غازی خان کی پہاڑیوں میں رہتی ہے۔ دراصل کھوسے' ہوتی اور مَنّت کانی وغیرہ سب ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں۔ سکھوں اور انگریزوں کی مہمات میں ان قبائلیوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا جس کے صلہ میں ان کو جاگیریں اور اراضی ملی۔

دریشک بھی ہوتیوں کی برادری کے ہیں۔ ان کا ذکر مزاریوں کے سلسلہ میں آ چکا ہے۔ ان کے آخری سرداروں میں سردار رورہن خان صوبائی درباری اور آنریری مجسٹریٹ تھا۔ اسے جاگیروں اور زمینوں سے بیس ہزار روپے کی آمدنی ہوتی تھی جو آگے چل کر وارثوں میں تقسیم ہوتی گئی۔

گورچانی اپنے آپ کو راجپوت کہتے ہیں۔ احمد شاہ درانی نے ان کو مالا مال کر دیا تھا۔ ان کے ایک سردار لال خان کو ایک وسیع علاقے کا مالک بنا دیا گیا اور اسے مالیہ اور لگان بھی وصول کرنے کے اختیار مل گئے۔ لال خان کے بعد جلاب خان نے لغاریوں سے رشتہ داری قائم کر لی۔ احمد شاہ درانی کے بعد سکھوں اور انگریزوں نے بھی اس خاندان کو خوب نوازا۔ ان کے ایک سردار غلام حیدر خان نے لغاریوں کو زیر کرنے کے لیے انگریز کی بڑی مدد کی۔ اس کے علاوہ جب بگٹی قبیلہ نے انگریزی عملداری پر حملہ کیا تو غلام حیدر ہی نے اسے پسپا کیا۔ انگریز نے پہلے گورچانیوں کو جرائم پیشہ قرار دے رکھا تھا لیکن ان کی خدمات سے خوش ہو کر ان کو جاگیر اور اراضی دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ سردار غلام حیدر کے بعد اس کے تمام بیٹے بھائی اور دیگر رشتہ دار انعامات اور عہدوں سے مستفید ہوئے۔ ان کی جاگیر "گورچانی تمن" کہلاتی ہے۔

یہی حال قیصرانیوں' سوری' لوندوں' ٹپی لوندوں' ختکانیوں اور سدوزئیوں کا ہے۔ ان کو انگریز کی خدمات کے صلہ میں ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ اسماعیل خاں میں کافی جاگیریں دی گئیں اور سرکار دربار میں عزت ملی۔

تمن داروں کی اس فہرست میں پیر صاحب تونسہ شریف بھی شامل ہیں۔ تونسہ کے میاں صاحب افغان قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے مورث میاں محمد سلمان 1696ء میں تونسہ میں آئے اور شاہ خواجہ نور محمد کے مرید ہوئے۔ ان کی پارسائی کا شہرہ دور دور تک تھا۔ خصوصاً بہاولپور کے نواب اور ختکانی سردار ان کے معتقد تھے۔ ان کا مزار تونسہ میں نواب بہاولپور ہی نے تعمیر کرایا تھا۔ ان کی اولاد میں سے میاں اللہ بخش کے مریدوں کا سلسلہ بھی وسیع تھا۔ مزار کی جائیداد خاصی تھی جس سے کئی نسلیں فائدہ اٹھا چکی ہیں۔

باب 31

ڈیرہ غازی خان کے بلوچ

پندرہویں صدی تک ڈیرہ غازی خان کا علاقہ ایک لق ودق صحرا کے سوا کچھ نہ تھا جو پنجاب کے جنوب میں دریائے سندھ کے کنارے انگڑائیاں لے رہا تھا۔ سلاطین دہلی اسے ملتان کا حصہ قرار دیتے رہے۔ تاہم اس میں آباد قبائل سے ان کا براہ راست کوئی واسطہ نہ تھا۔ ڈیرہ غازی خان کے ایک انگریز ڈپٹی کمشنر ایم ایل ڈیمز نے لکھا ہے کہ اس ضلع کی تاریخ کا آغاز رند بلوچیوں کی آمد سے ہوتا ہے جن کے ایک سردار ملک سہراب ڈوڈئی کا تذکرہ فرشتہ نے بھی اپنی تاریخ میں کیا ہے۔ وہ ملتان کے لنگاہ خاندان کے سلطان حسین کا ملازم تھا۔ اس نے سلطان سے دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ بے شمار اراضی حاصل کرلی۔ گورچانی اور میرانی اسی ڈوڈئی قبیلہ کی شاخ ہیں۔ ڈیرہ غازی خان کے جنوب میں نہر بھی آباد تھے۔ انہوں نے راجن پور اور جام پور وغیرہ پر قبضہ کر رکھا تھا۔

رند بلوچ سولہویں صدی کے آغاز تک اس علاقہ میں آکر آباد ہوتے رہے۔ انہوں نے تیس برس تک لشاری قبیلہ کے ساتھ جنگ کی۔ اس کے علاوہ مغلوں اور ترکوں کا بھی مقابلہ کیا۔ ان کے ایک سردار کا نام میر چاکر تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہمایوں کے ساتھ جاملا تھا اور اس کے ساتھ ہی دہلی جا پہنچا تھا۔ رفتہ رفتہ بلوچی نہ صرف ڈیرہ غازی خان بلکہ ڈیرہ اسماعیل خان، مظفر گڑھ، منٹگمری، سرگودھا اور بہاولپور میں پھیل گئے۔ میر چاکر کا مقبرہ اب بھی ساہیوال (منٹگمری) کے ایک مقام ست گھرہ میں موجود ہے۔

ڈیرہ غازی خان میں یوں تو بے شمار قبائل آباد ہیں لیکن منت کانی اور میرانی قبیلوں نے انگریز کا ہر قدم پر ساتھ دیا اور صلہ میں جاگیریں، زمینداریاں، خطابات اور انعام واکرام وصول کیے۔ "رؤسائے پنجاب" کے انگریز مصنف نے لکھا ہے کہ پنجاب میں شاید ہی کوئی خاندان ہمارا اتنا وفا شعار اور اطاعت گزار ہو جتنا ڈیرہ غازی خان کا بلوچ خاندان ہے۔

ان قبائل میں سب سے بڑا قبیلہ مزاریوں کا ہے۔ کسی زمانہ میں اسے "شورش پسند" کہا جاتا تھا لیکن جونہی وہ انگریز کا دم بھرنے لگا اسے معزز اور قابل فخر کہتے کہتے انگریز کی زبان خشک ہونے لگی۔ مزاری کسی زمانہ میں ڈیرہ غازی خان کے پورے جنوبی علاقہ پر عمر کوٹ تک قابض تھے اور ان کی ریاست کی سرحدیں سندھ اور بہاولپور کو چھوتی تھیں۔ اس قبیلہ کے کئی افراد شکارپور میں بھی آباد تھے۔ اس قبیلہ کے سربراہ کو "تمن دار" کہا

جاتا ہے۔ تمن داروں کا مورثِ اعلیٰ نواب بہرام خاں سی۔ آئی۔ ای تھا۔ شروع میں مزاری اپنے آپ کو بلوچیوں سے الگ سمجھتے تھے۔ وہ اپنا مورثِ اعلیٰ ہوت کو بتاتے ہیں جو بلوچی نسل کی پانچ بڑی بڑی شاخوں میں سے ایک کا سربراہ تھا۔ ہوت کے ایک بیٹے علی کے دو لڑکے تھے۔ صحاک اور پنوں۔ جب بلوچی پنجاب کے میدانوں میں اترے تو صحاک سندھ کے ایک شہر کشمور میں آباد ہوگیا۔ اس زمانہ میں مزاری بھبھور کی پہاڑیوں کے قریب رہتے تھے۔ کشمور کی منڈی اجناس اور کپڑے کی خرید و فروخت کے لیے مشہور تھی۔ صحاک نے یہاں کاروبار شروع کیا اور بڑا فائدہ اٹھایا۔ اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ مزاریوں نے اس کا ذکر اپنے سردار بزن سے کہا۔ ایک موقع پر جب مزاریوں کو کشمور کے لوگوں نے قید کرلیا تو بزن نے چار عورتیں صحاک کے پاس بھیجیں تاکہ ان کو چھڑا سکیں۔ صحاک نے حاکم سے سفارش کی جس پر چار آدمیوں کو رہا کردیا گیا۔ اس سے خوش ہو کر بزن نے صحاک کو اپنے پاس آنے کی دعوت دی۔ جب صحاک پہنچا تو مزاریوں نے اسے اپنا سردار منتخب کرلیا۔ بزن نے خود اپنی پگڑی صحاک کے سر پر باندھی اور اپنی لڑکی سے اس کی شادی کردی۔

صحاک کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام بلوچ تھا جس سے "بلوچانی" نکلا ہے اور چھوٹے کا نام شادین۔ صحاک کے بعد بلوچ اس کا وارث تھا لیکن اہل قبیلہ انتخاب کے قائل تھے۔ انہوں نے بلوچ کے لڑکے رادھو کو اپنا سردار منتخب کرلیا۔ تاہم انتخاب کے فوراً بعد زور کا جھگڑا چلا جس سے رادھو کی "ھری" یعنی جھونپڑی اڑ گئی۔ اسے بدشگونی پر محمول کیا گیا۔ چنانچہ انتخابات دوبارہ ہوئے۔ اب کے شادین کے بڑے لڑکے بدھیل کو سربراہ بنا لیا گیا لیکن بدھیل نے کہا کہ پہلے میں اپنی ماں سے مشورہ کرلوں۔ ماں نے تین شرطیں پیش کیں۔

1- اگر کوئی مزاری دوسرے کو قتل کردے یا بے عزت کرے (یعنی کسی لڑکی کو اغوا کرلے) تو اسے قبیلہ چھوڑ کر کم سے کم ایک سال تک جنگلوں میں رہنا ہوگا۔ وہ اسی وقت واپس آسکتا ہے جب زخم خوردہ خاندان اسے معاف کردے۔

2- اگر کوئی مہمان یا اجنبی آئے اور سردار کسی مزاری سے بھیڑ بکری لے کر اس کی تواضع کرے تو اس کی قیمت وصول نہیں کی جائے گی۔

3- سردار کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ تمام اہل قبیلہ سے ٹیکس وصول کرے۔

مزاریوں نے یہ شرائط فوراً قبول کرلیں اور بدھیل اس قبیلہ کا سردار بن گیا۔

بدھیل خان کے زمانہ ہی میں بلوچی میر چاکر کی سرداری میں وسطی پنجاب میں آکر آباد ہونا شروع ہوگئے لیکن ہیوتن نام کے جو بلوچی پہلے سے آباد تھے انہوں نے میر چاکر کو مار بھگایا۔ وہ دہلی میں ہمایوں بادشاہ کے پاس جا کر ملازم ہوگیا لیکن ابھی وہ تلمبہ (ملتان) پہنچا تھا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ کوئی ہے جو ہیوتن پر جا کر حملہ کرے اور میر چاکر کو سزا دے لیکن جب کوئی تیار نہ ہوا تو بدھیل خان نے کہا میں خود جاؤں گا۔ چنانچہ وہ میر

چاکر کے لڑکے صحاک اور ایک بوڑھے رند ہجر خان کو ہمراہ لے کر ہیوتن پر حملہ آور ہوا لیکن اس لڑائی میں رند اور ہجر دونوں مارے گئے۔ ہیوتن نے صحاک کی پسلیاں نکال لیں اور ان پر تھوکنے کے بعد ان کو آگ میں بھونا۔ ہجر خان رند کی لمبی سے داڑھی تھی۔ اس نے داڑھی اکھاڑ کر اس کی "چوری" بنائی جس سے مکھیاں جھلتے ہیں۔ تاہم اس درندگی کا ثبوت دینے کے بعد اس پر ساری عمر دہشت سوار رہی۔ اس نے ڈر کے مارے اپنی داڑھی بھی مونڈ ڈالی تاکہ کوئی اس سے ہجر کا سا سلوک نہ کرے۔ ہیوتن کو زیادہ انتظار نہ دیکھنا پڑا۔ جونہی میر چاکر کو اطلاع ملی وہ ست گھرہ سے مارچ کرتا ہوا آیا اور ہیوتن کو تہس نہس کر کے پہاڑوں میں بھگا دیا۔ ہیوتن ایک کھڈ میں گر کر ہلاک ہو گیا لیکن ایک مزاری نے جو اس کا پیچھا کر رہا تھا اس کی لاش کھڈ میں سے نکالی اور اسے سردار میر چاکر کے پاس لے آیا۔ میر چاکر نے اس کا سر کاٹا اور اس کی کھوپڑی سے اپنے لیے ایک پیالہ بنایا۔

کمیدی

باب 32

اٹک کے جاگیردار

اٹک کے علاقہ میں جو بڑے بڑے جاگیردار اور زمیندار آباد ہیں ان میں مکھڈی، کھیبے، کھٹڑ، اپیال، بنڈیال اور گوندل نمایاں ہیں۔

مکھڈ کے خانوں کا مورثِ اعلیٰ غازی خاں تھا۔ اس خاندان نے احمد شاہ ابدالی کے زمانہ میں عروج پایا۔ عباس خان نے شادی خان کے خاندان کا خاتمہ کر کے خان آف مکھڈ کا لقب اختیار کر لیا تھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد غلام مصطفیٰ خاں نے اس کے ورثا کو ختم کر کے قبیلہ کی قیادت خود سنبھال لی۔ درانی بادشاہوں کے زمانہ میں یہ قبیلہ خراج کے طور پر صرف 80 دنبے سلاطین دہلی کو پیش کیا کرتا تھا۔ لیکن سکھوں کے عہد میں اس خراج نے نقدی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ مکھڈ کے خوانین کو مالگزاری کا 1/8 حصہ دے کر باقی سکھ اٹھا کر لے جاتے تھے۔ اسی حصہ میں محصول چنگی، دریائے سندھ کی ریت سے نکالے ہوئے سونے کی آمدنی اور مکھڈ کے گھاٹ کی وصولی سب شامل تھے۔ جب پنجاب کا الحاق عمل میں آیا تو چونگی معاف کر دی گئی اور مکھڈ کے خانوں کو مالگذاری کا 1/4 حصہ ملنے لگا۔ اس کے علاوہ گھاٹ اور سونے کی آمدنی کا آٹھواں حصہ بھی ان کو دیا گیا۔ 49-1848ء کی شورش میں غلام مصطفیٰ خان نے انگریز سے غیر معمولی وفاداری کا اظہار کیا جس کے صلہ میں اسے راولپنڈی کے تین بڑے مالکان اراضی میں سے ایک تسلیم کر لیا گیا۔ اس کے بیٹے کو بھی "پنجاب کا بڑا سردار اور جاگیردار" مان کر اسے آرمز ایکٹ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ مکھڈ چونکہ ایک ایسے مقام پر واقع ہے جو انگریز کے زمانہ میں فوجی لحاظ سے اہم تھا اس لیے مکھڈ کے خوانین کی امداد بہت قیمتی خیال کی جاتی تھی۔ مکھڈ کے پیروں نے بھی پنجاب کی سیاست پر کافی اثر ڈالا ہے۔

کھٹڑ

اٹک اور فتح جنگ کی تحصیلوں میں کالا چٹا پہاڑ کے ساتھ ساتھ کھٹڑ قبیلہ کا اثر ہے۔ اس کا مورث اعلیٰ عبداللہ خان تھا۔ اہل قبیلہ کا دعویٰ ہے کہ وہ خراسان سے آئے ہیں اور ان کا شجرۂ نسب قطب الدین ایبک سے جا ملتا ہے۔ ایبک کا مقبرہ انارکلی کے پہلو میں ایبک روڈ پر ہے۔ وہ لکھ داتا مشہور ہیں۔ ایبک کے معنی ٹوٹی ہوئی انگلی ہے۔ پولو کھیلتے ہوئے پہلے ان کی انگلی ٹوٹ گئی پھر وہ خود گھوڑے سے گر کر ہلاک ہو گئے۔ وہ شہاب الدین غوری کے وائسرائے تھے۔ اس کے بعد خاندان غلاماں کے بانی بن کر اسلامی ہند پر حکمران ہوئے۔ تاہم کھٹڑوں کا ان سے

کوئی واسطہ نہیں۔ کھٹڑ راجپوت ہیں۔ چوہان کے دو بیٹے تھے۔ ھیر اور پسین۔ انہی کی اولاد اعوان بھی ہیں اور کھٹڑ بھی۔ جب سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو چوہانوں نے اس کی امداد کی۔ اسی قبیلہ کی ایک شاخ کا سردار کھٹڑ خاں تھا۔ وہ محمد غوری کے پاس ملازم ہو گیا۔ جب غوری نے پنجاب پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو کھٹڑ خاں بیوپاری کے لباس میں یہاں آیا اور اچانک نیلاب کے قلعہ کو فتح کرنے میں کامیاب رہا۔ نیلاب اس زمانہ میں دریائے سندھ پر اٹک کے نیچے ایک بارونق شہر تھا۔ اسی واقعہ کے بعد کھٹڑ خان کے تمام ساتھیوں نے اپنے قبیلہ کا نام کھٹڑ رکھ لیا۔ وہ اٹک کے گورنر جنگ خان کے ماتحت تھے۔ اس مرحلہ پر کھٹڑ مرتد بھی ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ کوئی جوگی نیلاب آیا اور اس نے کھٹڑوں کو بتوں کی پوجا کرنے کی ترغیب دی۔ جوگی جادوگر بھی تھا۔ اس نے کھٹڑوں پر کچھ ایسا جادو کیا کہ ان کے مویشی دودھ کی بجائے خون دینے لگے۔ جب عیسیٰ عبدالوہاب کو اوچ (بہاولپور) میں اس کی خبر ملی تو اس نے اپنے بیٹے شاہ نور عبدالرحمان کو بھیجا تاکہ کھٹڑوں کو شدھی سے بچائے۔ وہ نیلاب پہنچا تو شہر داخل ہونے سے پہلے اسے ایک بڑھیا ملی۔ اس نے پینے کے لیے دودھ مانگا تو بڑھیا نے بتایا کہ اس شہر پر کس طرح ایک آفت ٹوٹ پڑی ہے۔ شاہ نور عبدالرحمان نے کہا کہ میں خود گائے کو دوھ کر دیکھوں گا۔ لوگوں نے بڑا منع کیا لیکن اس نے تھنوں کو ہاتھ لگایا تو خون کی بجائے سفید شیریں دودھ نکلا۔ اس پر شاہ نور کی دھاک بیٹھ گئی اور لوگ اس کے اردگرد جمع ہو گئے۔ جب جوگی کو پتہ چلا تو اس نے ایک پرندے کا دھارن لیا اور اڑتا ہوا شاہ نور کو دیکھنے آیا۔ شاہ نور تاڑ گیا۔ اس نے پرندے کو کس کر اپنا جوتا مارا جس سے وہ مر گیا اور لوگ جادو کے پھندے سے آزاد ہو گئے۔ یہ کہانی اعوانوں اور کھٹڑوں دونوں میں مشہور ہے۔ ممکن ہے وہ ارتداد کے بعد تبلیغ سے پھر مسلمان ہو گئے ہوں۔

کھٹڑ خاں کے چھ بیٹے تھے جو تین پشتوں تک راولپنڈی سے دریائے سندھ تک تمام اراضی پر قابض رہے۔ گھیبوں اور اعوانوں کی طرح انہوں نے بھی پہلے سکھوں کا مقابلہ کیا اور پھر ان کے جاگیردار بن گئے۔ انگریزوں کے زمانہ میں ان کی جاگیریں اور زمینداریاں پختہ ہو گئیں۔ کھٹڑوں میں سے سردار سکندر حیات، سردار شوکت حیات وغیرہ سیاستدان ہیں۔

اپیال

فتح جنگ کی تحصیل کا جنوبی حصہ اپیال کے قبضہ میں ہے۔ وہ بھی راجپوت قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ چودھویں صدی میں یہاں آئے۔ پہلے خوشاب اور تلہ گنگ کے علاقے میں گھومتے رہے۔ پھر موجودہ مقام پر آکر آباد ہو گئے۔ ان میں سے چکری کے چودھری مشہور ہیں۔ پنجاب کے الحاق کے وقت چودھری شیر خان ان کا سردار تھا۔ شیر خان نے انگریز کی نمایاں خدمات انجام دیں جس کے صلہ میں اسے پنشن اور مالیہ معاف زمین ملی۔ جنگ آزادی میں مجاہدین کے خلاف صف آرا ہونے کے عوض انگریز نے اسے جاگیر کے علاوہ بے شمار انعام و اکرام

دیے۔

واہ کی کھٹڑ فیملی میں خان محمد اسلم حیات خاں مشہور ہوئے۔ وہ کھٹڑ خاں کے چوتھے بیٹے کی اولاد تھے۔ انہوں نے گھوڑ سواروں اور پیدل فوج سے نکلسن کی مدد کی۔ واہ میں ان کا مکان عطر سنگھ اٹاری والہ نے جلا کر خاک کر دیا تھا۔ ان کے خاندان نے سکھوں کے خلاف انگریز کا پورا ساتھ دیا، جس کا ان کو انعام ملا۔ واہ کی زمینوں کی ملکیت اب بہت سے وارثوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔

گھیبے

گھیبے پنجاب میں سیالوں اور ٹوانوں کے ساتھ ہی آئے تھے۔ وہ وادی سوان اور سندھ کے درمیان آباد ہوئے۔ ان کے پرگنے فتح جنگ اور پنڈی گھیب کہلاتے ہیں۔ یہاں بیٹھ کر انہوں نے اعوانوں، گکھڑوں اور جودھروں سے لڑائی کی۔ وہ احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے تو محفوظ رہے۔ لیکن سکھوں نے ان پر چڑھائی کی اور ان کے سردار رائے جلال کو اپنا باج گزار بنا لیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ان کو جاگیریں اور معافیاں دیں۔ 1848-49ء میں وہ نکلسن اور ایبٹ کے ساتھی تھے۔ اس طرح جنگ آزادی 1857ء میں بھی انہوں نے انگریز کا ساتھ دیا۔ اس کے عوض ان کو جاگیریں اور زمینداریاں بخش دی گئیں۔ سلطان فتح خاں سولہ دیہات کا مالک تھا۔ اس کا شمار ان تین بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا جو آرمز ایکٹ سے مستثنیٰ تھے۔ اس وقت بھی گھیبے اٹک کے ضلع میں سب سے بڑے زمیندار کہلاتے ہیں۔

گوندل

ہمایوں کے عہد میں کھٹڑ قبیلہ کا ایک فرد محمد صادق دہلی سے چھچھ آیا اور اٹک سے چھ میل دور اس نے فتوچک کی بنیاد رکھی۔ اس نے پشاور کی شاہراہ پر گوندل اور کئی دوسرے دیہات آباد کیے۔ بادشاہ نے اسے جاگیریں دیں۔ چھاچھیوں میں محمد صادق بہت پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اسے قاضی بنا دیا گیا۔ 1848ء میں سکھوں نے اس خاندان کو کافی نقصان پہنچایا اور اس کے تمام کاغذات ضائع کر دیے۔ لیکن جنگ آزادی 1857ء میں انگریز کا ساتھ دینے پر اس کے سربراہ کو جاگیروں، معافیوں، خلعتوں اور عہدوں سے نوازا گیا۔ اس وقت قاضی فضل احمد قبیلہ کا سردار تھا۔ یہ مراعات اب بھی چلی آ رہی ہیں۔

باب 33

بلوچستان کے سردار

انیسویں صدی کے وسط میں جب انگریز نے شمال مغربی ہندوستان پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے صوبوں کو از سر نو تقسیم کیا تو جو قبائلی ڈیرہ غازی خاں سے خیرپور (سندھ) تک پھیلے ہوئے تھے وہ زیادہ تر بلوچستان اور سرحد کے پہاڑی علاقوں میں سمٹ کر رہ گئے۔ ان قبائلیوں کے حسب و نسب کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کی اکثریت نواب جلال خاں کی اولاد پر مشتمل ہے۔ نواب جلال خاں (جس کا تذکرہ پچھلے ابواب میں ہو چکا ہے) کے چار بیٹے تھے۔ رند، لشار، ہوت اور کورائی۔ رفتہ رفتہ ان کی اولاد کئی ذیلی قبیلوں میں بٹ کر رہ گئی۔ 1961ء کی مردم شماری کی رو سے بلوچستان میں 18 اصل بلوچی، 28 بروہی اور 13 پٹھان قبائل آباد ہیں۔

افغان جنگوں کے زمانہ میں جب انگریز کابل کی طرف بڑھنے لگے تو رستہ میں بروہیوں نے ان کا مقابلہ کیا۔ انگریز نے ان کو سزا دینے کے لیے سر رابرٹ سنڈیمن کو بلوچستان میں اپنا پہلا ایجنٹ بنا کر بھیجا۔ اس نے ان قبائل کی ہیئت ترکیبی کا مطالعہ کیا تو اسے برطانوی راج کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے ساز گار پایا۔ اس نے قبائلیوں کو یکجا کر کے تمام سرداروں میں سے ایک کو "بڑا سردار" بنایا اور اس کا تقرر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس طرح بلوچستان میں "شاہی جرگہ" کی بنیاد پڑی اور قلات، مکران، خاران اور لس بیلہ کی ریاستیں وجود میں آئیں۔ ان چاروں ریاستوں میں ہر قبیلہ کا سردار حکومت برطانیہ خود مقرر کرتی اور اسے اعزاز و اکرام سے سرفراز کرنے کے بعد اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتی۔ ان میں سے ہر سردار اپنے علاقے میں خود مختار ہوتا۔ لیکن انگریز کے سامنے اس کی حیثیت یہ تھی کہ ایک مرتبہ سالانہ دربار کے موقع پر لاٹ صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ ان کی بگھی میں گھوڑوں کی بجائے سردار صاحبان خود جُت جائیں اور ان کو بنگلہ سے دربار تک لے جائیں۔ میر عبدالباقی بلوچ کا بیان ہے ("نوائے وقت" 22/ جنوری 1973ء) کہ سردار مری کے سوا تمام سرداروں نے حاکم اعلیٰ کی اس خواہش کو اپنے لیے فخر و مباہات کا موجب گردانا اور لاٹ صاحب کو خوش کرنے کے لیے تمام سردار بگھی میں جت گئے۔ اس موضوع پر بلوچی میں ایک نظم بھی ہے۔

ان قبائلی سرداروں کا نظام بے حد ظالمانہ ہے۔ سردار ایک طرح سے تمام قبائلیوں کی روح و جسم کا مالک ہوتا ہے۔ تمام عدالتی اور انتظامی اختیارات بھی اسی کے پاس ہوتے ہیں۔ اس کی مرضی کو "رواج" کا نام دیا جاتا ہے۔ ہر سردار نے اپنے علاقہ میں "ٹکری" یا معتبر رکھے ہوتے ہیں۔ وہ تمام لوگوں سے الگ الگ ٹیکس وصول کرتے

ہیں۔ اس کے علاوہ طرح طرح کی بیگار بھی لی جاتی ہے۔ مثلاً اونٹوں کی بیگار، بیلوں کی بیگار۔ عوام کو "رعیت" کہا جاتا ہے اور ان سے پیداوار کے چھٹے حصے کے علاوہ تحفے تحائف اور "مہمانی" کے نام پر نقدی اور مزید اجناس بھی بٹور لی جاتی ہیں۔ اگر کسی شخص کو بلاوجہ قتل کر دیا جائے تو "خون بہا" بھی تین سو روپے سے زیادہ نہیں ہے۔ پرانے زمانے میں "بجر" نام ایک تعزیری ٹیکس عائد کیا جاتا تھا جس کی رقم "اجتماعی مقاصد" پر خرچ ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ طرح طرح کے ٹیکس عائد ہیں۔ مثلاً "شلوار ٹیکس" اس وقت وصول کیا جاتا ہے جب کسی سردار کا بیٹا بڑا ہو کر "شلوار" پہننے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح "شیشک" ٹیکس ہے جس کے تحت پیداوار کا 1/6 حصہ سردار ہتھیا لیتا ہے۔ پھر "پش" ٹیکس ہے جو چٹائیاں بننے والے خودرو کھجور کے ریشے پر عائد کیا جاتا ہے۔

سرحد کی طرح بلوچستان میں بھی سرداروں نے اپنے قید خانے بنا رکھے ہیں جن میں قیدیوں کو "کاٹھ" (لکڑی کا پھندا) مار کر رکھا جاتا ہے۔ اگرچہ "بجر" اور "کاٹھ" یعنی جرمانے اور قید کی سزائیں اب منسوخ ہو چکی ہیں تاہم خفیہ طور پر اب بھی مروّج ہیں۔ کچھی میں ایک خفیہ قید خانہ مارشل لا کے دنوں میں دریافت ہوا تھا۔

بلوچستان میں سرداری ایک مخصوص خاندان تک محدود ہے جس کو "سردار خیل" کہتے ہیں۔ سردار کا بڑا بیٹا اس کا وارث ہوتا ہے لیکن پٹھانوں میں سرداری کا فیصلہ "جرگہ" کرتا ہے اور جو بیٹا بھی موزوں نظر آئے اسے سردار منتخب کر لیا جاتا ہے۔ بگٹی قبیلہ میں سرداری صرف روہیجوں کے لیے مخصوص ہے۔

خان آف قلات نے بلوچستان کی چاروں ریاستوں کو ملا کر جو وفاق قائم کر رکھا تھا اس کی اہمیت مغربی پاکستان کی وحدت کے زمانہ میں ختم ہو گئی، اس لیے اب مختلف قبائل جابجا پھر سر اٹھا رہے ہیں۔ ان میں بگٹی، زہری، مری، رئیسانی اور مینگل نمایاں ہیں۔ مارشل لا نمبر 117 کے تحت اگرچہ پٹ فیڈر کی تمام اراضی بے زمین کاشتکاروں اور مزارعوں میں تقسیم کی جا رہی ہے اور کوئلہ اور سنگ مرمر کی کانوں کو بھی سرکاری تحویل میں لینے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ تاہم اقتدار کی جنگ برابر جاری ہے۔ کوئلہ اور سنگ مرمر کی کانوں پر زیادہ تر لسبیلہ کے نواب قادر بخش، نبی بخش زہری اور اکبر بگٹی کا قبضہ ہے۔ ان کے کارخانوں میں کئی مرتبہ فساد بھی ہو چکے ہیں۔ اسی طرح پٹ فیڈر کے قریب و جوار کے قبائل زمین کی ملکیت کے سوال پر جھگڑا کر چکے ہیں۔ ملکیت کا یہی تنازع سیاسی رنگ اختیار کر رہا ہے۔ بعض سرداروں نے "آزاد بلوچستان" کا نعرہ لگایا ہے۔ جس کی بازگشت "لنڈن پلان" کی صورت میں سنی گی۔ فروری 1973ء کے اوائل میں روسی ساخت کے اسلحہ کی ایک بڑی کھیپ بھی اسلام آباد میں عراقی سفارت خانے سے پکڑی گئی۔ اس کے علاوہ سرحد اور بلوچستان میں بیرونی اسلحہ کی تقسیم وسیع پیمانے پر ہو رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بعض بیرونی طاقتوں کی انگیخت پر پاکستان اور ایران کے بلوچی "آزاد بلوچستان" کے قیام کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ حکومت نے اس خطرہ کے پیش نظر بلوچستان کی وزارت کو برطرف کر دیا ہے۔ تاہم پاکستان میں "سرداری نظام" کو ختم کرنے کے لیے آرڈی نینس جاری ہو چکا ہے۔ کانوں کو قومی ملکیت میں لیا جا رہا ہے اور پٹ فیڈر کی

زمینیں عوام میں بانٹی جارہی ہیں۔ بلوچستان رقبہ میں سندھ سے تقریباً دگنا ہے۔ ایک لاکھ 53 ہزار مربع میل کے اس علاقہ میں صرف 15 لاکھ نفوس آباد ہیں۔ لیکن وہ زرعی' صنعتی اور معدنی دولت سے مالا مال ہے۔ اگر جاگیردارانہ نظام کو ملیامیٹ کرنے کے بعد اسے پاکستان کے دوسرے صوبوں کی سطح پر لایا جائے تو قومی دولت میں بے پناہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ سندھ میں ہب' پرائی' ھنگول' تل اور دشت بہت سی ندیاں ہیں۔ ان سب کا پانی ضائع جارہا ہے۔ اگر جابجا بند باندھ دیے جائیں تو "دشت" کو بھی "مرغزار" بنایا جاسکتا ہے۔ گدو بیراج کی بدولت سی کے دو لاکھ ایکڑ زیر کاشت لائے جاچکے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ دوسری زمینوں کو بھی آباد نہ کیا جاسکے۔ زراعت کے علاوہ ماہی گیری' ریشم اور اون سازی' قدرتی گیس اور معدنیات کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔ پھر کئی جگہ سے نئی کانیں دریافت ہو رہی ہیں۔ اگر تحقیق و جستجو کا سلسلہ جاری رہا تو بے شمار قدرتی خزائن منظر عام پر آئیں گے جن سے پاکستان مالا مال ہو سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس "سرداریت" کا خاتمہ ہو جس نے سیاست کے روپ میں صوبے کے خرمنِ امن میں آگ لگا رکھی ہے۔

حمیدی

باب 34

ایوب خاں کی اصلاحاتِ اراضی

گذشتہ ابواب میں پاکستان کے دیسہ خداؤں کا شجرۂ نسب اس لیے پیش نہیں کیا گیا کہ تاریخ میں ان کے آباؤ اجداد کے کردار کو اجاگر کیا جائے' بلکہ بتانا یہ مقصود تھا کہ اس وقت پاکستان میں جو لوگ بڑے بڑے قطعات اراضی پر قابض ہیں' ان میں اکثریت ایسوں کی ہے جنہوں نے زمین اپنی جائز اور حلال کی کمائی سے نہیں خریدی بلکہ یا تو وراثت میں پائی ہے یا ان کو عطیہ اور انعام ملا ہے۔ جن لوگوں کے مالکانہ حقوق موروثی ہیں ان کے اَب وجَدّ پانچ دریاؤں کی سرزمین میں وارد ہوئے اور یہاں قبیلوی جنگوں میں الجھ کر اور مار دھاڑ کر کے بیشتر اراضی پر قابض ہو گئے۔ جن لوگوں کو عطیہ ملا انہوں نے یا تو زمانہ سازی سے کام لیا اور سکھ یا انگریز حملہ آوروں سے مل کر اپنے ہموطنوں سے غداری کی اور خفیہ اطلاعات بہم پہنچا کر یا فوج میں بھرتی ہو کر جاگیریں حاصل کیں اور بڑی بڑی زمینداریاں قائم کرلیں یا قیام پاکستان کے بعد متروکہ اراضی (بالاستحقاق یا بلا استحقاق) اپنے نام منتقل کرالی۔ اس کے بعد جب صدر ایوب کا دور آیا تو فوجی حکومت کی جڑیں مضبوط کرنے کے صلہ میں بیراجوں اور سرحدی علاقوں میں نہ صرف کئی کئی مربعے الاٹ کرا لیے بلکہ ان کی ترقی و نمود بھی سرکاری خرچ پر کی۔ یوں تو اس کی بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں' لیکن لاہور اور قصور کی سرحد پر جو کچھ ہوا اس کا تذکرہ اخبارات میں آچکا ہے۔ جرنیلوں کے علاوہ ایک سابق وزیر زراعت کا "ماڈل فارم" ہی پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس کی آرائش اور چمن بندی فلاں فلاں محکمہ کی مرہون منت ہے۔

جیسا کہ ان مضامین کی ابتدا میں بتایا جاچکا ہے۔ زراعت شماری کی رو سے مغربی پاکستان میں انچاس لاکھ کھیت ہیں جن کو تین درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1- چھوٹے کھیت:۔ یعنی پانچ ایکڑ سے کم۔ ان کی تعداد 24 لاکھ ہے۔ گویا کل کھیتوں کا 49 فیصد۔ ان چھوٹے چھوٹے کھیتوں کا مجموعی رقبہ 46 لاکھ ایکڑ ہے۔ یا یوں کہئے کہ پورے رقبہ زیر کاشت کا 9 فیصد چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں بٹا ہوا ہے۔

2- درمیانہ درجہ کے کھیت:۔ جن کا رقبہ 5 سے 25- ایکڑ تک ہے۔ ان کی تعداد 21 لاکھ ہے۔ گویا تمام کھیتوں کا 43 فیصد۔ درمیانہ درجہ کے ان کھیتوں کا مجموعی رقبہ دو کروڑ 33 لاکھ ایکڑ ہے۔ گویا پورے رقبہ کا 48 فیصد۔

3- بڑے کھیت:۔ جن کا رقبہ 25- ایکڑ سے اوپر ہے۔ یہ تعداد میں صرف چار لاکھ ہیں۔ گویا تمام کھیتوں کا آٹھ

فیصد۔ ان بڑے کھیتوں کا رقبہ دو کروڑ دس لاکھ ایکڑ ہے۔ گویا پورے رقبہ کا 43 فیصد۔

ان اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ 92 فیصد کھیت چھوٹے یا درمیانہ درجہ کے ہیں۔ ان کے باوجود ان کا رقبہ 57 فیصد سے زیادہ نہیں۔ پھر چھوٹے کھیتوں کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کا اوسط رقبہ 1.8-ایکڑ سے بھی کم ہے۔ اسی طرح درمیانہ درجہ کے کھیتوں کا رقبہ 11.3-ایکڑ ہے۔ ان دونوں کے مقابلہ میں بڑے بڑے کھیتوں کے رقبے کا اوسط 53.9 سے کم نہیں۔

جہاں تک ملکیت اراضی کا تعلق ہے وہ اس سے بھی زیادہ تشویشناک ہے۔ مغربی پاکستان میں خود کاشت مالکان اراضی کی تعداد بیس لاکھ ہے۔ گویا کُل مالکانِ اراضی کا 41 فیصد۔ ان لوگوں کے پاس ایک کروڑ ستاسی لاکھ ایکڑ زمین ہے یا مجموعی رقبہ کا 38 فیصد۔ اس کے برعکس جو لوگ مالک ہیں اور کاشت دوسروں سے کراتے ہیں ان کی تعداد 8 لاکھ ہے۔ گویا کل مالکانِ اراضی کا 17 فیصد۔ ان لوگوں کے پاس ایک کروڑ دس لاکھ ایکڑ زمین ہے یا مجموعی رقبہ کا 33 فیصد۔ ان دونوں کے مقابلہ میں مزارعوں کی تعداد 21 لاکھ ہے۔ گویا کل کاشت کاروں کا 42 فیصد۔ ان کی پاس ایک کروڑ 91 لاکھ ایکڑ زمین ہے۔ گویا مجموعی رقبہ کا 39 فیصد۔

اب مزارعت اور رقبہ کے لحاظ سے کھیتوں کی درجہ بندی کیجیے تو ذیل کا نقشہ ظہور میں آئے گا۔

	چھوٹے کھیت		درمیانہ کھیت		بڑے کھیت	
	تعداد ملین	فیصد	تعداد ملین	فیصد	تعداد ملین	فیصد
خود کاشت مالک	1.2	60	0.7	33	0.1	7
مالک و مزارع	0.2	33	0.4	55	0.1	12
مزارع	0.9	46	1.0	47	0.2	7

ان تمام نقشوں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو گا کہ مغربی پاکستان کی بیشتر اراضی پر یا تو بڑے بڑے رقبوں کے مالک دھرنا مارے بیٹھے ہیں جو خود کاشت نہیں کرتے، دوسروں سے کراتے ہیں یا وہ چھوٹے چھوٹے رقبوں میں بٹ کر رہ گئی ہے جس پر کاشت کاری کسی طرح بھی نفع بخش نہیں ہو سکتی۔ ملکیت اراضی کی اس غیر مساویانہ تقسیم کا اثر لازمی طور پر پیداوار پر پڑتا ہے۔ بڑے زمیندار اپنے پورے رقبہ کو زیر کاشت نہیں لاتے بلکہ وہ خزانے پر سانپ بن کر بیٹھے ہوتے ہیں۔ ان کی اکثریت "غائب باش" ہے۔ وہ دیہات کی بجائے شہروں میں بود و باش رکھتے ہیں اور ان کی دلچسپی کھیت سے زیادہ سیاست اور افسر شاہی سے وابستہ ہوتی ہے۔ مزارعوں کو چونکہ حق ملکیت حاصل نہیں ہے اور ان کی محنت کا 75 سے 90 فیصد ثمرہ مالکان اراضی اٹھا کر لے جاتے ہیں اس لیے وہ کبھی پوری دلجمعی سے کام نہیں لیتے۔ اس تشویش ناک صورت حال کا احساس ایوب حکومت کو ہوا تھا۔ اس نے ایک "لینڈ ریفارم کمشن" مقرر کیا جس نے 1959ء کے اوائل میں اپنی رپورٹ سابق صدر کو پیش کر دی۔ اس رپورٹ کی

بنیاد پر فروری 1959ء میں مارشل لاء ریگولیشن نمبر 64 نافذ کیا گیا، جسے بعد میں مارشل لاء ریگولیشن نمبر 64-الف و ب کے ذریعے ترمیم کیا گیا۔ مارشل لاء ریگولیشن نمبر 64 کے ذریعہ نافذ شدہ زرعی اصلاحات کے تحت:

1- زرعی اصلاحات کی حد ملکیت 500-ایکڑ نہری، یا 1000-ایکڑ بارانی، یا 36000-ایکڑ پروڈیوس انڈیکس یونٹ۔ جو بھی زیادہ ہو فی کس مقرر کی گئی۔

2- 8/ اکتوبر 1958ء کے بعد اگر کسی ایسے زمیندار نے جس کی اراضی مقرر شدہ حد ملکیت سے زیادہ تھی اور اس نے اپنی اراضی یا کچھ حصہ رہن، بیع یا ہبہ کیا تھا تو وہ رہن، بیع یا ہبہ کالعدم قرار دیا گیا۔

3- مذکورۂ بالا حد ملکیت اراضی سے یونیورسٹیوں اور منظور شدہ تعلیمی اداروں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا۔

4- دینی اور رفاہی اداروں کو بھی مقرر شدہ حد ملکیت اراضی سے مستثنیٰ کیا گیا۔

5- گھوڑی پال، گائے پال اور بکری پال فارموں کے مالکان کو بھی اس حد ملکیت اراضی سے فارموں میں استعمال آنے والی اراضی کی حد تک مستثنیٰ قرار دیا گیا۔

6- مالکان اراضی کو اختیار دیا گیا کہ مقرر شدہ حد ملکیت اراضی کے علاوہ 150-ایکڑ اراضی تک باغات کے مالک رہ سکتے تھے۔

7- مالک اراضی کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ حد ملکیت اراضی میں سے 18000 پروڈیوس انڈیکس یونٹ تک اراضی اپنے ورثا میں تقسیم کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ایسی مستورات جن کا وہ کفیل ہو ان کو 6000 پروڈیوس انڈیکس یونٹ تک منتقل کر سکتا تھا۔

8- مندرجۂ بالا حد ملکیت اراضی اور مستثنیات کے تحت آمدہ اراضی کے علاوہ تمام اراضی مالکان سے حاصل کر لی گئی اور ایک مقررہ فارمولا کے تحت حاصل کردہ اراضی کا معاوضہ مالکان اراضی کو دیا گیا۔

9- حاصل کردہ اراضی مزارعین اور گزارہ ملکیت سے کم کے مالکان کے پاس فروخت کرنا ممنوع قرار پایا اور فروخت کے وقت قابض مزارعین کا حق فائق تصور کیا گیا۔

10- غیر اقتصادی ملکیتوں کی فروخت اور تقسیم وغیرہ پر پابندی عائد کی گئی۔

11- مزارعین کی بیدخلی کے متعلق مروّجہ قوانین کو جاری رکھا گیا۔

ان اصلاحات کے تحت مغربی پاکستان میں 5218 مالکان اراضی نے گوشوارے داخل کیے جن میں 755 مالکان اراضی متاثر ہوئے۔ ان مالکان نے 39,86,286-ایکڑ اراضی کے گوشوارے داخل کیے جن میں 21,95,304-ایکڑ اراضی حاصل کی گئی۔ اس میں سے 8,81,517-ایکڑ اراضی زیر کاشت تھی، جس میں سے 5,69,218-ایکڑ اراضی مزارعین کاشت کر رہے تھے۔ بقایا خود کاشت تھی۔ 12,23,787-ایکڑ رقبہ غیر کاشتہ تھا جس میں سے 6,76,312-ایکڑ بنجر مگر قابل کاشت۔ 2,15,914-ایکڑ جنگلات۔ 1,34,882-ایکڑ پہاڑی۔ 1,02,169-ایکڑ

دریاؤں کی تہہ میں اور 1,94,506-ایکڑ رقبہ ناقابل کاشت تھا۔

حاصل کردہ اراضی میں سے 40,956-ایکڑ اراضی مالکان اراضی کو گھوڑی پال، گائے پال، بھیڑپال فارموں کے لیے پٹہ پر دے دی گئی۔ 2,64,976-ایکڑ اراضی حکومت کے مختلف محکموں کے نام منتقل کر دی گئی۔ 6,51,511-ایکڑ اراضی 56,906 مزارعین کے ہاتھ فروخت کی گئی اور 25,708-ایکڑ اراضی 2161 چھوٹے مالکان اراضی کے ہاتھ فروخت کی گئی۔

متاثرہ زمینداروں کی تعداد جیساکہ بیان کیا گیا ہے 755 تھی۔ ان کے پاس 14,58,973-ایکڑ اراضی حد ملکیت اراضی کے لحاظ سے رہی۔ اس کے علاوہ باغات کی شکل میں 5237-ایکڑ اراضی بھی ان کے پاس رہی۔ زمینداروں نے اس کے علاوہ 39,728-ایکڑ اراضی اپنے ورثا میں تقسیم کی اور 22,281-ایکڑ اراضی اپنی زیر کفالت مستورات کے نام منتقل کی۔ حاصل کردہ اراضی میں سے 6 زمینداروں کی، جن میں پانچ کا تعلق صوبہ سندھ سے ہے اور ایک کا بہاولپور سے، 1,53,955-ایکڑ اراضی کا منیجر مقرر کیا گیا اور یہ اراضیات شکار گاہیں متصور ہوئیں۔ یہ اراضیات ویسے اصلاحات سے قبل انہی زمینداروں کی ملکیت تھیں۔ مختصر یہ کہ ان اصلاحات سے 56,902 مزارعین اور 2561 چھوٹے مالکان کو فائدہ پہنچا اور انہیں مجموعی طور پر 6,77,119-ایکڑ اراضی دستیاب ہوئی۔

تاہم بحیثیت مجموعی ایوب زرعی اصلاحات کے نتیجہ میں پرنالہ وہیں کا وہیں رہا۔ کیونکہ اراضی ہیر پھیر کر بڑے زمینداروں کے پاس رہی۔ جن لوگوں پر ان اصلاحات کا اثر پڑ سکتا ہے ان میں سے صرف پانچ ہزار نے اپنے رقبہ کا اعلان کیا جو 55 لاکھ ایکڑ سے آگے نہ بڑھا (حالانکہ تمام زمیندار صحیح صورتحال بتاتے تو یہ رقبہ 74 لاکھ ایکڑ ہونا چاہیے تھا)۔ بایں ہمہ ظاہر کردہ رقبہ میں سے بھی حکومت کے حوالے صرف 24 لاکھ ایکڑ کیے گئے۔ ان میں سے بھی ساڑھے سات لاکھ ایکڑ 2 لاکھ مزارعوں کو فروخت کیے گئے۔ باقی رقبہ میں سے ساڑھے سولہ لاکھ ایکڑ یا تو نیلام کر دیے گئے یا سرکاری محکموں کو دے دیے گئے یا شکار گاہوں کے لیے مخصوص کر دیے گئے۔ جہاں تک بڑے زمینداروں کے ورثا اور عزیز و اقارب کا تعلق ہے ان کو 4 لاکھ 20 ہزار ایکڑ دیے گئے۔ اس طرح ایوب حکومت کے خاتمہ تک ساڑھے سات لاکھ ایکڑ زمین ایسی تھی جس کے متعلق تب تک کوئی فیصلہ نہ ہوا تھا۔ غرض، ایوبی دور کی زرعی اصلاحات نے مزارعوں کا مسئلہ حل کرنے میں کوئی مدد نہ کی۔ جس ملک میں 20 لاکھ بے زمین کاشتکار خاندان ہوں اس میں اگر صرف 2 لاکھ افراد کو زمین دے دی جائے تو زرعی اصلاحات کا کیا فائدہ؟ ستم ظریفی کی انتہا ہے کہ جن زمینداروں کو، جاگیردارانہ قوت کو ختم کرنے کا دعویٰ کیا گیا تھا ان کو اپنا 67 فیصد رقبہ ہیر پھیر کر اپنے پاس ہی رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ پھر کون نہیں جانتا کہ جو زمین حکومت کے حوالے کی گئی وہ انتہائی ناقص اور ناقابل کاشت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ 24 لاکھ ایکڑ حاصل کردہ زمین میں سے صرف چار لاکھ ساٹھ ہزار ایکڑ مزارعین

نے خریدی۔ باقی 32 فیصد انہوں نے ناقابل استعمال قرار دے کر مسترد کر دی۔ لطف یہ ہے کہ جو 18 فیصد رقبہ شکار گاہوں کے لیے مخصوص کیا گیا ہے وہ انتہائی زرخیز تھا اور اسے سرکاری افسروں کی چشم پوشی کے طفیل حکومت کے حوالے نہیں کیا گیا۔ یہی حال ایوبی دور کی دوسری زرعی اصلاحات کا ہے۔ اشتمال اراضی کی بیل بھی منڈھے نہ چڑھ سکی اور زراعتی ترقیاتی بنک نے چھوٹے کاشت کاروں کو امدادی روپیہ بھی نہ دیا۔ بلکہ تمام قرضے بڑے زمینداروں کی جھولی میں ڈال دیے۔

باب 35

عوامی دور کی زرعی اصلاحات

صدر مملکت ذوالفقار علی بھٹو نے یکم مارچ 1972ء کو عوامی زرعی اصلاحات کا اعلان کیا جو درج ذیل ہے:

عزیز شہریو، کاشتکارو اور ہاری دوستو!

آج کی رات تمہاری رات ہے۔ میں تم سے زرعی اصلاحات کے بارے میں گفتگو کر رہا ہوں۔ اس کا مقصد آپ کو ان اہم فیصلوں سے آگاہ کرنا ہے جو ہم نے موجودہ ظالمانہ اور غیر منصفانہ زرعی نظام کو بدلنے کے لیے کیے ہیں۔ ہمارے عوام صدیوں سے اس نظام کو خموشی سے برداشت کرتے چلے آرہے ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ پاکستان پیپلز پارٹی نے شروع ہی میں ناانصافی کے خلاف اپنی جدوجہد کے دوران بھی جاگیرداری کی لعنت کو مٹانے اور زمین پر انسان کی غیر منصفانہ مالکیت کو ختم کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

یہ اصلاحات، جن کا آج اعلان کیا جارہا ہے، بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان سے عام آدمی کی زندگی پر ان اقدامات کے مقابلے میں گہرا اثر پڑے گا جو ہم مستقبل میں کرنا چاہتے ہیں۔ ان سے ہمارے دیہی عوام کی عزت بڑھے گی۔ انہیں ظلم و ستم سے نجات حاصل ہوگی اور آج سے وہ زمینی پستیوں سے اپنا سربلند کرنے کے قابل ہو جائیں گے اور اپنے وقار، عزت، مردانگی اور خودداری کو دوبارہ حاصل کرلیں گے۔

اس زرعی نظام کی خامیاں تو بہت زیادہ ہیں جن میں ہم نے تبدیلی کی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ان کا کوئی مکمل حل بھی نہیں۔ ہر معاشرے کو اپنی روایات، حالات اور حدود کے اندر رہ کر اپنے لیے موزوں اقدامات کرنے پڑتے ہیں۔

ہمارے معاشرتی اور اقتصادی ڈھانچے میں بہت وسیع اور شرمناک حد تک تضاد موجود ہے۔ اس کا دائرۂ عمل اور کسی جگہ اتنا روشن نہیں رہا جتنا ہمارے دیہاتی علاقوں میں ہے۔ ہمارے مزارعین کی غالب اکثریت خدا جانے کب سے غلامی اور غربت کے جال میں گرفتار چلی آرہی ہے۔ مزدور اور کام کرنے والے انسان کے طبعی وقار کو غالباً اس بری طرح سے کہیں اور مجروح نہیں کیا گیا جیسا یہاں ہوتا رہا ہے۔ اب ہم اس مکروہ رجحان کو مزید جاری رہنے کی اجازت نہیں دیں گے۔

زرعی مسائل ذرا پیچیدہ واقع ہوئے ہیں۔ زرعی اصلاحات میں چونکہ زمین رکھنے کی حد کا سوال بھی ہوتا ہے اس لیے یہ کام مشکل ہونے کے ساتھ ساتھ پیچیدہ بھی بن جاتا ہے۔ مسائل چاہے کتنے ہی گہرے کیوں نہ ہوں

ہمیں ان کی تہہ تک پہنچنا ہے۔ سطحی قسم کے اقدامات نقصان دہ ہوں گے، کیونکہ ان کا واسطہ مسائل سے براہ راست نہیں ہوگا اور ہمیں ان کی اصلیت کو معلوم کرنا ہے۔ اگر زرعی اصلاحات سے کاشتکار کی سماجی اور اقتصادی زندگی میں انقلابی تبدیلیاں واقع نہ ہوں گی تو پھر ہمارے یہ اقدامات محض رسمی اور روایتی بن کر رہ جائیں گے۔

آپ کی حکومت زرعی اصلاحات کے جس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ رکھتی ہے وہ ایک وسیع دائرہ پر محیط ہے۔ اس سے نہ صرف دولت اراضی کا غیر منصفانہ ارتکاز مؤثر طور پر ختم ہو جائے گا بلکہ آمدنیوں میں جو نمایاں فرق پایا جاتا ہے وہ بھی کم ہو جائے گا۔ پیداوار بڑھ جائے گی، بے روزگاری بڑی حد تک دور ہو جائے گی۔ مالگزاری اور زرعی ٹیکسوں کا نظام بہتر ہو جائے گا۔ نیز زمین دار اور کسان کے درمیان احترام اور باہمی مفاد کے تعلقات کی بنیادیں حقیقی طور پر قائم ہو جائیں گی۔

ابتداً ہم انفرادی ملکیت اراضی کی انتہائی حدیں گھٹا کر بہت کم کر رہے ہیں۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ دولت اراضی کے ارتکاز نے منصفانہ اور خوشگوار معاشرتی نظام کی نشوونما کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ ہم اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ ایک طرف تو چند افراد وسیع اراضیات پر قبضہ کیے رہیں اور دوسری طرف وہ لاکھوں آدمی جو قوم کی دولت پیدا کرنے میں کوشاں ہیں کسمپرسی کی حالت میں زندگی بسر کریں۔

اس نئی انتہائی حد کا تعین کرتے وقت کئی بامقصد باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس میں اہم ترین بات یہ ہے کہ زراعت کو ایک دلکش اور منافع بخش پیشے کی حیثیت حاصل رہے۔ مزید برآں اراضی اتنی ہو کہ اس میں جو سرمایہ لگایا جائے اس سے زیادہ فائدہ حاصل ہو تاکہ پیداوار بڑھ سکے۔ اس کے علاوہ حوصلہ منداور روشن خیال کاشتکار زراعت کا پیشہ ترک نہ کریں اور کاشتکاری کو وہ مقصدیت حاصل ہو جس کی وہ بجا طور پر مستحق ہے۔ انہی اہم اسباب کی بنا پر ہم روشن خیال سرمایہ کاروں کے لیے بھی قطعاً اسی اصول پر عمل کر رہے ہیں۔ ہم جس طرح جاہل اور جابر زمیندار کے خلاف ہیں اسی طرح بڑے بڑے لٹیرے صنعت کاروں کے خلاف بھی ہیں۔ جس طرح ہم تخلیقی صلاحیت رکھنے والے اور انسان دوست زمینداروں کے حق میں ہیں اسی طرح پیداوار کرنے والے فرض شناس مالکان صنعت کے طرف دار بھی ہیں۔

بڑے غور و فکر کے بعد ایک فرد کی زرعی اراضی کی ملکیت کی حد 500 نہری ایکڑ سے کم کر کے ڈیڑھ سو ایکڑ نہری اور بارانی کی حد ایک ہزار سے کم کر کے تین سو ایکڑ یا پندرہ ہزار پیداواری یونٹ کے برابر یا ان میں سے جو بھی زیادہ ہو مقرر کی جاتی ہے۔ صاف صاف لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ حد ملکیت کو ایک ہی اقدام میں 70 فیصد کم کیا جارہا ہے اور اس سلسلے میں ان مراعات اور مستثنیات کو ملحوظ نہیں رکھا گیا جو 1959ء کی اصلاحات کے تحت دی گئی تھیں۔

زرعی اراضی کی انتہائی حد ملکیت خاندان کے بجائے فرد کی بنیاد پر مقرر کرنے کے سوال کا بڑی غور سے جائزہ لیا

گیا ہے' کیونکہ اس میں شرعی احکام کا پہلو بھی شامل ہے۔ لہٰذا ہم نے مشہور و معروف علما اور فقہا سے مشورہ کیا اور ان کی رہنمائی بھی حاصل کی ہے۔ ظاہر یہ ہوا کہ اسلام فرد کے حقوق کو مقدس سمجھتا ہے اور خاندانی ملکیت کے نظام کو تسلیم نہیں کرتا اور ایک مسلمان کی حیثیت سے ہم کسی ایسے نظام کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے جو اسلامی احکام کے منافی ہو۔ لہٰذا اسلامی احکامات کو مدنظر رکھتے ہوئے اراضی کی حد ملکیت خاندان کے بجائے فرد کی بنیاد پر مقرر کی جا رہی ہے۔

ہمارے جیسے وسیع ملک میں جہاں زرعی اراضی کی پیداوار اور آمدنی ہر علاقے میں مختلف ہے کیونکہ اس کی وجہ زمین کی قدرتی صفات کا اختلاف ہوتا ہے اور اس کے علاوہ آب و ہوا' پانی کی دستیابی اور اسی طرح کے کئی اور عوامل بھی ہیں جن کے باعث اس کی پیداوار اور آمدنی میں فرق پایا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر زرخیز زمین کو بنجر زمین کے برابر تصور کیا جائے اور دونوں کے لیے ایک ہی حد مقرر کی جائے تو یہ بات نہ صرف غیر معقول بلکہ احمقانہ ہوگی۔ اس طرح ان علاقوں کے ساتھ صریحاً ناانصافی ہوگی جو قدرتی طور پر کم زرخیز ہیں۔ حتیٰ کہ یورپ میں بھی جہاں زمین کی نوعیت میں بہت کم فرق ہے وہاں بھی زرعی پیداوار ہر علاقے میں مختلف ہے اور یہ ایک ایسا عمل ہے جسے یورپ کی اقتصادی برادری نے بھی تسلیم کیا ہے۔ لہٰذا ایک ایسے نظام پر عمل کرنے سے انصاف کے تقاضے پورے ہوں گے جس میں ان قدرتی اور ناگزیر عوامل کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ نیز یہ کہ مختلف زرعی پیداوار اور پیداواری یونٹ کی بنیاد پر اراضی کی آخری حد مقرر کرنے سے انصاف کا تقاضا بھی پورا ہو جائے گا۔ درحقیقت یہی وجہ ہے کہ سب سے پہلے مرحلے میں پیداواری یونٹ معیار مقرر کیا گیا اور یہی 1947ء کے بعد زرعی اراضی کی تقسیم اور الاٹمنٹ کے لیے معیار چلا آ رہا ہے۔ اس لیے ہمارے منشور میں بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے جو بالکل عیاں ہے۔

1959ء کی زرعی اصلاحات ایک ڈھکوسلا تھیں۔ وہ برائے نام اصلاحات تھیں جن کا مقصد لوگوں کو اصلاحات کے نام پر بے وقوف بنانا تھا۔ ان اصلاحات کے تحت نہ صرف یہ کہ 36 ہزار کی سب سے اونچی حد مقرر کی گئی تھی بلکہ ان اصلاحات میں اپنی پسند کے جاگیردار ٹولے کو ہر قسم کی مراعات دی گئی تھیں اور ایک خاص طبقے کو پروان چڑھایا گیا۔ درحقیقت اس طرح جو یونٹیں فراہم کی گئی تھیں وہ 72 ہزار سے لے کر 80 ہزار یونٹوں تک ہو جاتی تھیں۔ میں ذیل میں اس کی وضاحت کرتا ہوں۔

36 ہزار یونٹوں کی انتہائی حد کے علاوہ انفرادی مالکوں کو مزید ڈیڑھ سو ایکڑ پھلوں کے باغات برقرار رکھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ مزید برآں کسی موجودہ مالک کو یہ بھی حق دیا گیا تھا کہ وہ اپنے جانشینوں کو اٹھارہ ہزار یونٹوں کے برابر علاقہ تحفہ دے سکتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس کے خاندان کی ہر زیر کفالت خاتون کو بغیر کسی پابندی کے چھ ہزار یونٹ رکھنے کی اجازت تھی۔ یہ فراڈی اسکیم یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ شکار گاہوں' مویشی خانوں اور

چراگاہوں کو ان کے سائز کا لحاظ کیے بغیر زرعی اصلاحات کے دائرہ سے پورے طور پر خارج رکھا گیا۔ مثال کے طور پر ایک مستثنیٰ شکار گاہ ایک لاکھ ایکڑ سے زیادہ رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس طرح ایسے کئی ایک مویشی خانے اور چراگاہیں تھیں جن میں سے ہر ایک ہزاروں ایکڑ پر پھیلی ہوئی تھی۔ ایسے ہی کئی ٹرسٹ بھی تھے جو بلا امتیاز مستثنیٰ کر دیے گئے تھے۔ ان پر فریب مستثنیات کے نتیجہ میں کسان بہت سی قیمتی زمینوں سے محروم ہو گئے جو دس لاکھ ایکڑ سے زیادہ علاقہ پر مشتمل تھیں۔

ہم ایسی مستثنیات یا مراعات کی اجازت نہیں دے رہے ہیں۔ اول یہ کہ متعلقہ مالکوں کو اس کی اجازت نہیں ہوگی کہ وہ کوئی متاثرہ علاقہ اپنے جانشینوں کو یا زیر کفالت خواتین کو بطور تحفہ منتقل کر سکیں جس طرح کہ 1959ء کی اصلاحات کے تحت جائز تھا۔

دوسرے یہ کہ ساری شکار گاہیں واپس لے لی جائیں گی اور زمینیں کسانوں میں تقسیم کر دی جائیں گی۔ صرف وہ تاریخی شکار گاہیں مستثنیٰ ہوں گی جن کا انتظام حکومت کرے گی۔ مقررہ انتہائی حد سے زیادہ جو پھلوں کے باغات' مویشی خانے اور چراگاہیں اور صراحت کردہ ٹرسٹ ہوں گے وہ مستثنیٰ نہیں ہوں گے۔ صوبائی حکومتیں وہ طریقہ کار متعین کریں گی جن سے حاصل کردہ زمینوں کو مصرف میں لایا جا سکے۔ اگر ممکن ہوا تو ان کا انتظام حکومت کرے گی لیکن اگر مفاد عامہ کا تقاضا ہوا تو انہیں پٹہ پر دے دیا جائے گا۔ اس صورت میں سابق مالک کو انکار کا پہلا حق حاصل ہوگا۔

تاہم انصاف کے طور پر ہم موجودہ مالکوں کے سرمایہ کو نظرانداز نہیں کر سکتے جو انہوں نے ٹیوب ویل لگا کر' ٹریکٹر خرید کر نئی زمینوں کو قابل کاشت بنا کر اور زرعی پیداوار کے مہنگے جدید طریقے اختیار کر کے صرف کیا۔ اس لیے ہم ازروئے انصاف اس بات پر مجبور ہیں کہ اگر کسی موجودہ مالک کے پاس 20 دسمبر 1971ء کو یا اس سے پہلے کوئی ٹریکٹر تھا یا اس نے کوئی ٹیوب ویل لگایا تھا تو اسے تین ہزار یونٹوں کے برابر مزید علاقہ رکھنے کی اجازت دیں۔

اس سلسلہ میں ہم صرف ایک استثنا کی اجازت دے رہے ہیں جس کا تعلق تسلیم شدہ تعلیمی اداروں مثلاً یونیورسٹیوں سے ہے۔ انہیں مقررہ انتہائی حد سے زیادہ رقبہ کی اراضی رکھنے کی اجازت ہوگی۔ 1959ء کی زرعی اصلاحات کے برخلاف اس استثنا کی اجازت کسی دیگر ادارے کو نہیں ہوگی۔

سب کو معلوم ہے کہ بلوچستان کے پٹ فیڈر ایریا میں سرکاری اراضیات پر متعدد بااثر اشخاص نے ناجائز قبضہ جما رکھا ہے اور ان اراضیات پر استحقاق کے بارے میں طویل عرصہ سے تنازعہ چل رہا ہے۔ اس سے غریب کاشتکاروں اور مزدور کسانوں کو لامتناہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ چنانچہ اس افراتفری کو ختم کرنے اور کسانوں کو اراضیات مہیا کرنے کے لیے حکومت نے پٹ فیڈر ایریا کی تمام اراضیات کو کسی معاوضہ کے بغیر اور تمام پابندیوں سے آزاد اپنے قبضہ میں لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس طرح حاصل کی ہوئی اراضیات اس علاقہ کے غریب

کسانوں کو دی جائیں گی۔

اب میں پاکستان میں زمین ہتھیانے کی تاریخ کے ایک انتہائی بھیانک اور شرمناک باب کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ سرکاری ملازمین کے طبقہ نے انتہائی بے غیرتی کے ساتھ اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے سندھ اور پنجاب دونوں جگہ مختلف بیراجوں کی وسیع اراضیات حاصل کرلیں۔ اس طرح غیر حاضر زمینداروں کا ایک نیا طبقہ پیدا ہوگیا۔ اس استحصال کے علاوہ جو اس طریقہ کا لازمی نتیجہ ہے اس نے مقامی اہلکاروں پر مزید بار ڈال دیا جنہیں ایسے غیر حاضر زمینداروں کے لیے مقررہ آمدنی کا انتظام کرنا ہوتا ہے جو بیشتر اوقات ان کے اعلیٰ افسر بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر کسی سرکاری ملازم نے اپنی ملازمت کے دوران میں یا ریٹائرمنٹ کے دوران میں ایک سو ایکڑ سے زیادہ اراضی حاصل کی ہے تو وہ تمام اراضی جو ایک سو ایکڑ سے زیادہ ہوگی بحق سرکار ضبط متصوّر ہوگی۔ لیکن اس کا اطلاق مسلح افواج پر نہیں ہوگا کیونکہ ان کے معاملہ میں تو اراضیات سرزمینِ وطن کا دفاع کرنے والوں کو دی گئی تھیں۔

بعض اعلیٰ فوجی افسروں نے سرحدی علاقوں میں بھی اراضیات حاصل کی تھیں۔ سرحدی علاقوں میں بھی اراضیات کا الاٹ منٹ اس خاص مقصد کے تحت کیا گیا تھا کہ ریٹائرڈ فوجی عملہ کی ایک دفاعی ریزرو لائن قائم ہو جائے۔ تاہم ایسے کئی واقعات ہوئے جن میں بعد کو ان اراضیات کا ان الاٹیوں نے اندرون ملک کی بہتر اراضیات سے تبادلہ کرلیا۔ اور اس طرح سرحدی علاقوں میں اراضیات کے ابتدائی الاٹ منٹوں کا مقصد ہی ختم کردیا۔ اس لیے ہم نے ایسی تمام اراضیات کے حقوق مالکانہ منسوخ کرنے کا فیصلہ کیا ہے جنہیں دفاعی پٹی کے سرحدی علاقہ میں واقع ہونے کے عوض ملک کے محفوظ اندرونی حصوں میں حاصل کیا گیا ہے۔

تمام سرکاری اراضیات خالصتاً ان کاشتکاروں کو دینے کے لیے ہوں گی جن کے پاس اراضی نہیں ہے یا جو ایسی اراضی کے مالک ہیں کہ اس سے ان کی گزر بسر نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے جس گاؤں یا دیہہ میں وہ اراضی واقع ہوگی، وہاں کے لوگوں کو ترجیح دی جائے گی۔ اس زمین سے کافی علاقہ دفاعی افواج کے لیے محفوظ رکھنا پڑے گا۔

تمام سرکاری زرعی اراضیات کے نیلام پر پابندی لگادی جائے گی۔ سرکاری اراضی کی قیمت آسان قسطوں میں وصول کی جائے گی۔ ایسی اراضیات کو سالانہ پٹے پر دیے جانے کی پالیسی کو ترک کردیا گیا ہے۔

زمینداروں اور مزارعین کے باہمی تعلقات ملک اور عوام دونوں کے لیے بہت بڑی تشویش کا باعث بنے رہے ہیں۔ ان کے آپس کے جھگڑوں اور دشمنی کی وجہ سے ایسے مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے جن سے زرعی پیداوار اور معاشرے کے امن و امان کو ٹھیس پہنچی ہے۔ ان حالات کو سدھارنے کے لیے میں نے کچھ واضح اقدامات کیے ہیں۔ وہ یہ ہیں:

یک طرفہ اور معاندانہ بے دخلی کی کارروائیاں فی الفور بند کردی جائیں گی۔ آئندہ بے دخلیاں

صرف اس صورت میں ممکن ہوں گی کہ مزارعین بٹائی کا حصہ یا اراضی کا لگان نہ دیں یا زراعتی ضروریات کو پورا نہ کریں۔

ملک بھر میں آبیانہ ادا کرنے کی ذمہ داری اب مزارع کے بدلے زمیندار پر عائد ہوگی۔ اس کے علاوہ تمام زراعتی ٹیکس بھی آئندہ کے لیے خالصتاً زمیندار ہی کو ادا کرنے پڑیں گے۔

اس طرح مزارع کی طرف سے بیج کی قیمت ادا کرنے کا مروجہ طریقہ ختم ہوجائے گا۔ آئندہ کے لیے زمیندار خود بیج فراہم کرنے اور اس کی قیمت ادا کرنے کے ذمہ دار ہوں گے۔ باقی ماندہ متعلقہ اخراجات زمیندار اور مزارعین میں برابر تقسیم ہوجائیں گے۔

زمینداروں کا مزارعین سے بلامعاوضہ خدمت لینا یا جبری لگان وصول کرنا ملک بھر میں غیر قانونی متصور ہوگا۔

اراضی کی فروخت کے سلسلے میں اس اراضی کے مزارع کو حق شفع حاصل ہوگا۔

یہ انقلابی مراعات جو کاشت کاروں کو دی جارہی ہیں ان سے ان کی اقتصادی حالت کے بہتر ہونے کی نئی راہیں کھل جائیں گی۔ مجھے یقین ہے کہ اس طرح حقوق کاشت کا تحفظ ہوگا اور مزارعین پر ٹیکس کا بوجھ بھی کم ہوگا اور انہیں حق شفع مل جانے سے مزارعین کی دیرینہ خواہشات اور امنگیں پوری ہوجائیں گی۔

میرے دوستو اور ہم وطنو! آپ برائے مہربانی خود اس تضاد کا اندازہ لگائیں اور آپ خود انصاف کریں کہ 1959ء کی زرعی اصلاحات اور ان اصلاحات میں جو میں اب نافذ کر رہا ہوں کس قدر فرق ہے۔ میں نے جاگیرداری کی کمر توڑنے کے لیے نہ صرف اراضی کی انتہائی حد کم کردی ہے بلکہ میں کاشتکاروں کے لیے نئی زندگی اور ایک نیا نظام لانے کی غرض سے ایک قدم اور آگے بڑھ گیا ہوں۔ میں نہ صرف بے جا مستثنیات اور ملکیت کی اونچی حد کم کر رہا ہوں بلکہ نئے قانون کے تحت بلامعاوضہ تمام زمین لے رہا ہوں اور سب سے اہم بات یہ کہ وہ تمام اراضی جو واپس لی گئی ہے اسے اس کے کاشت کاروں کو منتقل کر رہا ہوں۔ ان اصلاحات کے تحت زمین کاشت کرنے والے کو جو زمین دی جائے گی اس کے لیے اسے ایک پیسہ بھی ادا نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ ایسی اراضی کے نئے مالک ہوں گے جو انہیں مفت ملے گی۔ اور اس سلسلے میں ان پر کوئی ذمہ داری یا واجبات نہیں ہوں گے۔ ان اصلاحات کے تحت ان کا فائدہ یہ ہوگا کہ انہیں مفت زمین ملے گی جو ان کے گاڑھے پسینے کا معاوضہ ہے کیونکہ صدیوں سے وہ ان زمینوں پر یہ پسینہ بہاتے چلے آرہے ہیں۔ علاوہ ازیں ان سے کوئی قسط جو 1959ء کی زرعی اصلاحات کے تحت واجب الادا تھی نہیں لی جائے گی۔

مالکانِ اراضی بڑے پیمانے پر زرعی اراضی کو منتقل کرتے رہے اور وہ یہ سب کچھ ایک ایسے انداز سے کرتے رہے ہیں جس کا مقصد زرعی اصلاحات کو ناکام بنانا تھا لیکن میں بتادینا چاہتا ہوں کہ ہم ایسی سازشوں کو ہرگز کامیاب

نہیں ہونے دیں گے۔ میں یہاں پُر زور الفاظ میں اپنے اس عزم کو دہراتا ہوں کہ ایسے طفیلی اور عوام دشمن لوگوں کو بالکل معاف نہیں کیا جائے گا۔

ایسے ناجائز لین دین کو ختم کرنے کی غرض سے ایسے فرد کی طرف سے جس کے قبضے میں 15 ہزار یونٹ کے مساوی زمین یا اس سے زیادہ تھی 20/ دسمبر 1971ء کے بعد اس کی طرف سے اراضی کی منتقلی یا ایسی اراضی میں کسی کو کھاتہ شریک بنانے کی اگر کوئی کارروائی کی گئی ہے تو ایسی کارروائی بلا چون وچراں غیر قانونی سمجھی جائے گی۔ منتقل کرنے والے کی اراضی کا تعین کرتے وقت ان رقبوں کو بھی اس کی ملکیت سمجھا جائے گا۔ نیز ایسی منتقلیاں جو زمین کو خاندان میں واپس لے آئیں چاہے وہ تیسرے شخص کے ذریعہ ہوئی ہوں کالعدم ہوں گی اور مالک کے پاس جائیں گی۔ جس شخص کے پاس یکم مارچ 1967ء کو پندرہ ہزار یونٹوں کے برابر رقبہ سے زیادہ رقبہ ہو گا اسے ایسی تمام منتقلیوں کو ظاہر کرنا پڑے گا جو اس نے پچھلے پانچ سال میں کی ہیں اور ان کی جانچ اس لیے کی جائے گی تاکہ لین دین کی اصلیت کا اندازہ لگایا جائے۔ اگر منتقلیاں دوسرے اشخاص کے حق میں کی گئی ہیں وہ اس وقت تک جائز نہیں ہوں گی جب تک منتقل کرنے والا ہر شک سے بالاتر یہ ثابت نہ کر دے کہ یہ لین دین صحیح تھا۔ اور اخیر میں آپ کو متنبہ کر دیتا ہوں کہ اگر کوئی جھوٹی بات ظاہر کی گئی تو املاک ظاہر کرنے والے اور اس کے متعلقین کی ساری املاک خواہ زمین ہو یا دوسری اشیاء فوراً ضبط کر لی جائے گی۔

مشینی کاشت اور اشتمال اراضی کی حوصلہ افزائی کرنے کی فوری ضرورت کے مطابق اور ٹکڑے کرنے کی روک تھام کرنے کے لیے حکومت کسی خاندان کو فراخدلانہ طور پر اشتمال اراضی کی اجازت دے گی بشرطیکہ یہ اراضی صوبائی حدود کے اندر ہو اور پندرہ ہزار یونٹوں کی مقررہ حد سے متصادم نہ ہو۔ اس طرح موجودہ مالک کو یہ حق ہو گا کہ اپنی پسند کا رقبہ مقررہ حد تک کے اندر برقرار رکھے اور اس خاندان کے دوسرے متاثرہ یا غیر متاثرہ مالکان زمین سے اپنی اراضی کا تبادلہ کرے۔

زمینوں کے ٹکڑے کرنے کی برائیوں کو روکنے کے لیے اپنے ارادہ کا مزید اظہار کرنے کی غرض سے مشترکہ اراضی کی حقیقی تقسیم اور اراضی کی علیحدگی پر موجودہ پابندیاں جاری رہیں گی۔ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ اراضی کے ٹکڑے نہیں ہوں گے اور منفعت بخش یونٹوں کو غیر منفعت بخش یونٹوں سے منسلک کیا جا سکے گا۔

ہمارا ریونیو کا نظم ونسق اور زرعی ٹیکس کا نظام فرسودہ ہو چکا ہے۔ دنیا کی ہر چیز تیزی سے بدل رہی ہے لیکن ہمارا ریونیو کا نظام برابر ماضی سے جڑا رہا ہے۔ ریونیو ریکارڈوں کو بعد میں رکھنے' حقوق مالکانہ کی دستاویزات کی نقل حاصل کرنے میں دشواریاں پیدا کرنے' مال گزاری کے چھوٹے چھوٹے اہلکاروں کو فائدہ یا نقصان پہنچانے کے وسیع اختیارات استعمال کرنے' زرعی لگانوں کی شرحوں میں اتار چڑھاؤ پیدا کرنے اور مال گزاری کی کارروائیوں میں طوالت پیدا کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ خصوصاً جس غلط طریقہ سے مقامی اہلکار اپنے فرائض انجام

دیتے ہیں بلکہ اپنے فرائض سے کوتاہی برتتے ہیں اسے تو قطعاً برداشت نہیں کیا جائے گا۔ اس فرسودہ نظام نے تو صرف رشوت ستانی' ایذا رسانی اور انتقام کے مواقع ہی فراہم کیے ہیں۔ اس نظام میں اگر کاٹ چھانٹ نہ بھی کی جائے تب بھی اس پر پوری طرح نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔

میری رائے ہے کہ لگان اور آبیانہ کی تشخیص یکساں شرح کی بنیاد پر کی جائے تاکہ ضرورت سے زیادہ ٹیکس نہ وصول کیا جائے۔ مال گزاری کا نقصان نہ ہو اور رشوت ستانی اور ایذا رسانی کا سدباب ہو جائے۔ ریونیو افسروں اور ان کے ماتحت عملہ کا یہ واضح فرض ہونا چاہیے کہ وہ کسانوں کی مدد کریں نہ کہ انہیں نقصان پہنچائیں۔ مال گزاری کے سادہ اور عام فہم طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔ یعنی ایسے طریقے جنہیں ہر شخص پوری طرح سمجھ سکے اور جن کی تشریحات صرف اہلکاروں کے طبقہ کی اجارہ داری نہ ہو۔

بہرحال ضرورت اس بات کی ہے کہ ماہرین کی کمی اور عوام کے نمائندوں کے تفصیلی غور وخوض کے بعد یہ مسائل حل کیے جائیں اس لیے میں ایک کمیشن کی فوراً تشکیل کا حکم دے رہا ہوں۔

ہمارے سامنے سب سے بڑا کام یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں پیداوار کیسے بڑھائی جائے۔ ایسا مربوط منصوبہ شروع کرنا چاہیے جس سے موثر تعلیمی اور تربیتی پروگرام کے ذریعہ چھوٹے کسانوں کے علم میں اضافہ ہو۔ ساتھ ہی اس بات کی بھی پوری کوشش کرنا چاہیے کہ زراعت کے لے ضروری اشیاء کی رسد باقاعدگی سے پہنچتی رہے۔ ان چھوٹے کسانوں کو امدادی قیمتوں' زراعت کے لیے ضروری اشیاء کی رعایتی قیمتوں اور مارکیٹنگ کی سہولتوں کی صورت میں اپنے کام کے لیے ترغیبات مہیا کی جائیں گی۔

فی الواقعہ ہمیں امداد باہمی پر مبنی زراعت کے لیے تمام سہولتیں مہیا کر کے دیہی امداد باہمی کو ترقی دینا ہو گی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس طرح حقیقی دیہی جمہوریت کو فروغ ہو گا۔ استحصال کا سدباب ہو جائے گا۔ وسائل کی یکجائی کے ذریعہ پیداوار بڑھ جائے گی۔ امداد باہمی کی نمائندہ یونینوں کے توسط سے باہمی یگانگت ومفاہمت میں اضافہ ہو گا اور دلال جو غیر ضروری منافع کماتے ہیں وہ ختم ہو جائے گا۔

زراعت کے پیشہ میں افراد کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے اور فصلیں اگانے کے موجودہ روایتی طریقوں سے ہمارے مزدوروں کی اتنی بڑی تعداد کی پوری طرح کھپت نہیں ہوتی۔ بے روزگاری اور کم روزگاری کی مصیبت کو ختم کرنے کے لیے بہت سے اقدامات کیے جائیں گے۔ اس لیے ہم ایک عظیم دیہی تعمیراتی پروگرام کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں جس کے تحت دیہی علاقوں میں زراعت پر مبنی صنعتیں اور زرعی بستیاں اور گھریلو صنعتیں قائم کی جائیں گی۔

زراعت کے فروغ اور دیہی ترقی کو روکنے کے لیے روپیہ کی کمی کو ہمیشہ بہانہ بنایا گیا۔ دیہی علاقوں میں کارکردگی اور زندگی کے حالات افسوسناک اور معیار انسانیت سے گرے ہوئے ہیں۔ لہٰذا میں نے ہدایت کی ہے کہ زرعی

ترقی کے لیے اور اس امدادی پروگرام کے لیے جن کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے دس ارب روپے کی رقم مختص کی جائے۔ عمل در آمد کا کام پوری رفتار اور جوش سے کیا جائے گا۔

زرعی اصلاحات کے یہ اقدامات فوراً نافذ العمل ہوں گے۔ ان کا اطلاق شمال مغربی سرحدی صوبہ کے قبائلی علاقے کے سوا تمام علاقوں پر ہو گا' خواہ ان کا سروے کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو۔

میں مارشل لا کا ایک ضابطہ جاری کروں گا جس سے میرے منصوبے پر تیز رفتاری سے پوری طرح عمل در آمد ہو گا۔ ہر صوبہ میں ایک لینڈ کمشن قائم کیا جائے گا تاکہ اصلاحات پر عمل در آمد کیا جائے اور اگر کسی قسم کے تضاد کا پتہ چلے تو انہیں دور کیا جائے۔

ایک سخت ٹائم ٹیبل نافذ کیا جائے گا۔ 30/ اپریل 1972ء تک اراضی ظاہر کرنا پڑے گی۔ 15/ جون 1972ء تک ان پر فیصلے کیے جائیں گے اور یکم جولائی 1972ء تک ان فیصلوں پر عمل در آمد کیا جائے گا۔

اور اخیر میں زیر کاشت فصل کے بارے میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ موجودہ ربیع فصل موجودہ مالکوں کی ہو گی' کیونکہ انہوں نے اس پر سرمایہ اور محنت صرف کی ہے۔ کسی قسم کی چوری کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ دوسری خریف فصل نئی قانون سازی کے دائرہ کے اندر آئے گی۔

ایسے ملک میں جہاں ایک عرصے سے جاگیردارانہ نظام رائج ہے اور جہاں زرعی اراضی ایک وسیع اور انتہائی پیچیدہ نظام آب پاشی کے تحت آتی ہے ایسی صورت حال کے پیش نظر ہم نے جو کچھ کیا وہ ایک بہت بڑا کام ہے۔ ہم نے ان ملکوں کی نسبت جہاں ایسے ہی حالات پائے جاتے ہیں بہت کچھ بلکہ زیادہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر عراق میں نہری زمین کی انتہائی حد ملکیت 625-ایکڑ اور بارانی زمین کی حد ساڑھے بارہ سو ایکڑ مقرر کی گئی ہے۔ ترکی میں 1250-ایکڑ۔ ایران میں ایک ہزار ایکڑ نہری زمین اور دو ہزار بارانی زمین۔ شام میں 200-ایکڑ نہری زمین اور 750-ایکڑ بارانی زمین۔ فلپائن میں ساڑھے سات سو ایکڑ اور کیوبا میں 167-ایکڑ کی آخری حد مقرر کی گئی ہے۔ غرض کہ انقلاب روس کے بعد لینن نے زمینداروں کو جس حد تک زمین اپنے پاس رکھنے کی اجازت دی تھی اس طرح ہم بھی پیداواری یونٹ کے اعتبار سے زمین کی حد مقرر کر رہے ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ جاگیرداروں کی کیا طاقت ہوتی ہے۔ مجھے قبائلی سرداروں کی مطلق العنانی' وڈیروں اور ملکوں کی قوت کا بخوبی علم ہے۔ وہ ان زرعی اصلاحات کو ناکام بنانے کی غرض سے ہر حربہ استعمال کرنے کی کوشش کریں گے۔ میں یہاں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس کی ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی۔ ایسے تمام عوام دشمن عناصر کے ساتھ مارشل لا کی پوری قوت کے ساتھ نمٹا جائے گا۔ مزارعین کے دفاع میں اور ان اصلاحات کے ذریعہ کیے گئے انصاف کا بول بالا رکھنے کے لیے آپ کی حکومت کی عمل داری جس طرح پنجاب اور سندھ کے ہموار میدانوں میں چلے گی اسی طرح یہ بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کے پہاڑوں اور چٹانوں میں بھی ہو گی۔

عزیز شہریو! میں نے آپ کے سامنے آپ کی حکومت کی زرعی اصلاحات کا منصوبہ بیان کر دیا ہے۔ یہ کام بے حد کٹھن ہے' لیکن یہ ایسا کام ہے جسے نہ تو ہم نظر انداز کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس میں کوئی تاخیر کی جا سکتی ہے۔ اس پر ہماری معیشت کے استحکام اور ہمارے عوام کی خوش حالی کا دارومدار ہو گا۔ اس کے لیے زبردست وسائل' پوری لگن اور عوام کی مکمل حمایت درکار ہو گی۔ میں نے سماجی اور اقتصادی انصاف کو یقینی بنانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ میں نے اس قدیم اور ظالمانہ جاگیرداری نام کا نام و نشان مٹانے کا پختہ عزم کر رکھا ہے جس نے عرصۂ دراز سے ہمارے عوام کا سکھ چین چھینا ہوا ہے۔ لیکن کامیابی کے لیے مجھے آپ کی مدد درکار ہے۔ مجھے آپ کی حمایت کی ضرورت ہے۔ مجھے آپ کی طاقت درکار ہے۔ مجھے آپ کے عزم اور جرأت کی ضرورت ہے۔ آج کا دن تاریخی دن ہے' کیونکہ ایک ہی ضرب سے ہم نے اس برائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے جس نے عرصۂ دراز سے ہماری اس حسین و دلکش سرزمین کے چہرے کو داغ دار بنا رکھا تھا۔

ہم نے اپنے بیٹوں اور پوتوں کے لیے ایک نئی اور پُر عزم دنیا کے دروازے کھول دیے ہیں اور اس طرح ہم نے اپنی آئندہ نسلوں کے مستقبل کو محفوظ بنا دیا ہے۔

اللہ اور بندوں سے میں نے جو وعدہ کیا تھا اس پر میں قائم رہا ہوں۔ آج کے دن پاکستان کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اور تاریخ کا یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ کتابِ حریّت میں یہ ایک سنہری باب کا اضافہ ہے۔ معینہ گھڑی آ پہنچی ہے۔ ٹوٹی ہوئی زنجیروں کی جھنکاریں ہمارے لیے پیغام مسرت لے کر آئی ہیں۔ کل نہیں البتہ جمعہ تین مارچ کو عام تعطیل رہے گی تاکہ اس تاریخی دن کی بے پایاں سعادتوں اور تکمیل وعدہ کے حسن و عظمت کی یاد تازہ کی جا سکے۔

باب 36

زرعی انقلاب کی طرف

ہم وطنو' مزارعو اور ہاریو---!

"آج کی رات تمہاری رات ہے۔ میں تم سے زرعی اصلاحات کے بارے میں گفتگو کرنے والا ہوں۔ میں تم کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہم نے وہ ظالمانہ اور غیر منصفانہ زرعی نظام بدل دینے کا فیصلہ کرلیا ہے جس کو تم صدیوں سے بڑی خاموشی کے ساتھ برداشت کر رہے تھے"۔

صدر بھٹو نے یکم مارچ 1972ء کو جس اعلان کا آغاز مرقومہ بالا الفاظ کے ساتھ کیا اسے ختم اس بانگِ دہل پر کیا:

"آج کا دن عہد آفرین ہے کیونکہ ہم نے ایک ہی ضرب سے وہ روگ جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے جس نے اس ارض حسیں کا چہرہ صدیوں سے مسخ کر رکھا تھا۔ ہم نے اپنے بچوں اور ان کے بچوں کے لیے ایک جرأت آزمائی دنیا کا دروازہ کھول دیا ہے۔ ہم نے اپنی نسلوں کا مستقبل محفوظ کر دیا ہے۔ میں خدا اور اس کے بندوں کے سامنے سرخرو ہو رہا ہوں۔ آج کے دن نے پاکستان کو ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کیا ہے۔ یہ تاریخ میں کوئی شعبدہ بازی نہیں ہے۔ اس سے کتاب آزادی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ زنجیریں کٹ رہی ہیں۔ آؤ ہم سب مل کر جشن منائیں"۔

صدر بھٹو کے ان الفاظ میں جس درد اور اخلاص کی جھلک ہے وہ محتاج تصریح نہیں۔ یوں تو اصلاحات کا طنطنہ لارڈ کارنوالس کے زمانہ سے سنائی دے رہا ہے لیکن 1926ء کے "زرعی کمیشن" سے لے کر 1958ء کے "اراضی کمیشن" تک جتنی سفارشات بروئے کار آئی ہیں ان کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ بڑے زمینداروں کے مفاد کا تحفظ کیا جائے۔ خواہ اس سے مزارعین کے حلقۂ زنجیر میں اور بھی اضافہ ہو جائے۔ اس کے برعکس صدر بھٹو نے جن اصلاحات کا خاکہ پیش کیا ہے ان کے لفظ لفظ سے وہ شرارے پھوٹ رہے ہیں جو صدر ایوب کے نام نہاد "سبز انقلاب" کی سبزی چاٹ کر پاکستان کو ایسی "تاریخی ناگزیریت" سے دوچار کر دیں گے جس کا دوسرا نام "زرعی انقلاب" ہے!

دوسری جنگ عظیم کے بعد جب تمام ممالک اپنے اپنے معاشی نظام کی چولیں درست کر رہے تھے تو بڑی طاقتوں نے محسوس کیا کہ ان کے پاس نہ تو وافر مقدار میں خام مال ہے جو ان کے کارخانوں اور ملوں کے لیے ایندھن کا کام دے سکے' نہ منڈیاں اور بازار ہیں جو ان کی مصنوعات کو جذب کر کے سیم و زر میں ڈھالتے

رہیں۔ خام مال کی بہم رسانی اور مصنوعات کی کھپت کے لیے وہی ممالک موزوں ہو سکتے تھے جو نو آبادیاتی نظام سے چھٹکارا پانے کے بعد ہنوز اپنے وسائلِ ترقی کا جائزہ لے رہے تھے۔ اقوامِ متحدہ نے ایک طرف پسماندہ زرعی ممالک کو مشورہ دیا کہ وہ خام اجناس میں اضافہ کے لیے نئے طریق کار اختیار کریں اور دوسری طرف بڑے ممالک سے سفارش کی کہ نہ صرف ان کی تکنیکی رہنمائی کریں بلکہ پیداوار بڑھانے کے لیے ان کی دامے درمے امداد بھی کریں۔ فائدہ چونکہ دونوں کو پہنچ سکتا تھا اس لیے مفاہمت میں دیر نہ لگی۔

یو۔این کی زرعی اصلاحات

U THAN T

اوتھانٹ کے زمانہ میں "تعمیر و ترقی کے عشرے" منانے کی داغ بیل ڈالی گئی۔ صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ ممالک سے کہا گیا کہ اپنی مجموعی قوت پیداوار کا کم از کم ایک فیصد پسماندہ یا نیم ترقی یافتہ ممالک کی امداد و اعانت کے لیے وقف کر دیں۔ اگرچہ سن ساٹھ کے عشرے میں شاید فرانس کے سوا کوئی ملک بھی اس ہدف تک نہ پہنچ سکا۔ تاہم جتنی بھی اقتصادی امداد ملی اس سے ترقی پذیر ممالک کو جہاں یہ نقصان پہنچا کہ اربوں روپے کے قرض تلے دب کر رہ گئے' وہاں یہ فائدہ بھی ہوا کہ وہ اپنی زرعی معیشت کی بنیادیں استوار کرنے کے قابل ہو گئے۔ بایں ہمہ چونکہ کوئی ملک بھی یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی معیشت یکرنگ بن کر رہ جائے اس لیے وہ زراعت کے ساتھ ساتھ صنعت کو بھی فروغ دینے کی کوشش کرتے رہے۔ ترقی یافتہ ممالک کو یہ رجحان قدرتی طور پر ناگوار گزرا۔ انہوں نے نہ صرف طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے ابھرتے ہوئے ممالک کی مصنوعات کی حوصلہ شکنی کی بلکہ خام اجناس کی قیمتیں بھی گرانا شروع کر دیں تاکہ وہ صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ علاقوں کے دست نگر بن کر رہ جائیں۔ ادھر جب ترقی پذیر ممالک نے یہ صورت حال دیکھی تو عافیت اسی میں سمجھی کہ خود کفالتی کی راہ اختیار کریں اور خام اجناس کی بہم رسانی کا رخ بیرونی ممالک کی بجائے اپنے کارخانوں کی جانب موڑ لیں۔ اس سے ترقی یافتہ صنعتی ممالک میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ انہوں نے کچھ تو وہ پابندیاں نرم کر دیں جو انہوں نے ترقی پذیر ممالک کی مصنوعات کی خریداری پر لگا رکھی تھیں اور کچھ اقوام متحدہ پر زور دیا کہ زرعی ممالک کو خام اجناس کی پیداوار بڑھانے پر مجبور کرے۔

چنانچہ اوتھانٹ نے ایک کمیٹی مقرر کی جس نے فروری 1970ء میں یہ رپورٹ پیش کی کہ خام اجناس کی پیداوار میں کمی کا بڑا سبب یہ ہے کہ نیم ترقی یافتہ ممالک میں معیشت ناہموار ہے۔ کسی کے پاس تو ہزاروں ایکڑ زمین ہے اور کسی کے پاس ایک انچ بھی نہیں۔ نتیجۃً "کاشت کاروں کی ایک بڑی تعداد" کمین" اور غلام بن کر زندگی گزار رہی ہے۔ بڑے زمیندار چونکہ زراعت میں دلچسپی نہیں لیتے اور چھوٹے کاشت کاروں کے پاس نہ اپنی زمین ہے نہ سرمایہ اس لیے نہ کوئی محنت کرتا ہے نہ پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔ کمیٹی نے سفارش کی کہ تمام ترقی پذیر ممالک زرعی اصلاحات بروئے کار لائیں اور نہ صرف ملکیت اراضی کی حد بندی کریں بلکہ کاشت

کاری کے جدید طریقے بھی اختیار کریں۔ جن میں بیج' کھاد اور کرم کش ادویہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

سبز انقلاب

اقوام متحدہ پر چونکہ زیادہ تر سرمایہ دار طاقتیں قابض ہیں اس لیے انہوں نے اپنے اپنے دائرہ میں اس سفارش کو تو زرعی ممالک کی صوابدید پر چھوڑ دیا کہ اراضی کی مساویانہ تقسیم عمل میں لائی جائے اور ان تجاویز کو اپنی امداد کی شرائط میں شامل کر لیا کہ خام اجناس کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے عمدہ بیج' کیمیاوی کھادیں اور کرم کش ادویہ استعمال کی جائیں اور اس کا نام "سبز انقلاب" رکھا۔ سبز انقلاب کی تحریک دراصل اس سے بہت پہلے امریکہ میں اٹھ چکی تھی۔ وہاں کے صنعت کاروں نے جب دیکھا کہ خام اجناس کی پیداوار کم ہو رہی ہے جس سے ان کے کارخانوں کے تباہ ہونے کا اندیشہ ہے تو انہوں نے سائنس دانوں کو عمدہ بیج اور کھادیں دریافت کرنے پر لگا دیا۔ تاکہ ان کے ذریعے کسانوں کو پیداوار بڑھانے پر آمادہ کیا جا سکے۔ "میکسی پاک گندم" اور "اری چاول" اسی سائنسی تحقیقات کا ثمرہ ہیں۔ "میکسی پاک" بونے قد کے ایک گیہوں کا نام ہے جس کی بالیوں میں عام گیہوں کے مقابلہ میں زیادہ دانے ہوتے ہیں اور ان سے آٹا بھی زیادہ مقدار میں برآمد ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ آٹا صرف ڈبل روٹی کے لیے موزوں ہے اور پاکستانی مزاج کے موافق نہیں ہوتا۔ یہ گیہوں راک فیلر اور فونڈیشن کے سائنس دانوں نے میکسیکو اور پاکستان کی گندم کا پیوند لگا کر دریافت کی اور اس کے بعد مختلف ممالک کی آب و ہوا میں اس کے اگانے کے تجربات بھی کیے۔ ایک سائنس دان بورلا کو اس دریافت پر 1970ء میں نوبل پرائز بھی مل چکا ہے۔ اسی طرح اری پاک چاول نے منیلا' فلپائن کے بین الاقوامی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ارتقائی مراحل طے کیے۔ یہ چاول ہمارے یہاں کے کھردرے اور موٹے چاول سے مختلف نہیں تاہم اس کے خوشے میں بھی چاول کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔

صدر ایوب کے عہد میں یہ دونوں بیج ملک بھر میں پھیلا دیے گئے جس کے نتیجہ میں چاول اور گندم دونوں کی پیداوار میں ستر پچھتر فیصد اضافہ ہوا۔ اس پر ان بیجوں کا نام "معجز نما" رکھ دیا گیا اور ابلاغ عام کے تمام ذرائع سے عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ صدر ایوب نے ان بیجوں کے ذریعہ سے ملک میں ایک "سبز انقلاب" برپا کر دیا ہے جس کے سامنے سرخ انقلاب کے پرچم بھی سرنگوں ہو گئے ہیں۔ لیکن اس پروپیگنڈے کی قلعی بہت جلد کھل گئی۔ ماہرین نے بتایا کہ ان دونوں بیجوں کی نشوونما کے لیے ایک تو آبپاشی کی بہت زیادہ ضرورت پڑتی ہے جس کے وسائل پاکستان میں محدود ہیں۔ دوسرے ان بیجوں کا پودا کھاد کثرت سے مانگتا ہے اور اگر کیمیاوی کھاد استعمال کی جائے تو بیس پچیس برس میں کھیتی بنجر اور بانجھ ہو جاتی ہے۔ تیسرے میکسی پاک اور اری پاک چاول دونوں کے بیجوں اور پودوں پر کیڑے مکوڑوں کا ہجوم ہو جاتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ یہ تینوں نقائص امریکی صنعت کاروں کے حق میں جاتے تھے بلکہ اگر کہا جائے کہ "سبز انقلاب" کے بانی خود بھی چاہتے تھے کہ یہ نقائص

پیدا ہوں تو غلط نہیں کیونکہ ان کے پیش نظر کاشت کاروں اور صارفوں کا فائدہ نہیں تھا بلکہ فالتو پیداوار کو ہڑپ کرنے کے علاوہ اپنا وہ مال فروخت کرنا بھی تھا جو امریکہ میں ضرورت سے زائد تیار ہو چکا تھا۔ چنانچہ جونہی ان نقائص کا چرچا عام ہوا' ہمارے اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے یہ اعلان ہونے لگے کہ فاسفیٹ اور نائیٹریٹ کی کھادیں استعمال کرو' کیڑے مکوڑے مارنے والی ادویہ کا استعمال بڑھا دو' آبپاشی کے لیے ٹیوب ویل لگاؤ۔ اسی پر بس نہیں امریکہ کے امدادی اداروں نے حکومت پاکستان کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ قرض ہم سے لے اور کھادیں اور ادویہ منگوائے۔ چنانچہ گزشتہ دس برس میں اربوں روپے کا یہ سامان پاکستان میں آ چکا ہے۔ لیکن اس بات پر بہت کم غور کیا گیا کہ آخر ملک کو کیا فائدہ پہنچا؟

نئے بیج کے معجزے

ابتدا میں کہا گیا تھا کہ معجز نما بیجوں کے طفیل گندم' چاول اور مکئی کی پیداوار میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ پہلے اگر ایک ایکڑ زمین میں 8ء8 من گندم پیدا ہوتی تھی تو اب 6ء12 من پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح چاول کی فی ایکڑ پیداوار بھی دس بارہ من فی ایکڑ سے بڑھ کر ستر اسی من ہو گئی ہے۔ وزارت زراعت کے اعداد و شمار کے مطابق 68-1967ء میں ایک کروڑ 24 لاکھ ستر ہزار ٹن چاول اور 63 لاکھ 75 ہزار ٹن گیہوں پیدا ہوئے۔ تین سال بعد 70-1969ء میں یہ مقدار علی الترتیب ایک کروڑ 41 لاکھ 62 ہزار اور 72 لاکھ 81 ہزار ہو گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اسی عرصہ میں چاول کا زیر کاشت رقبہ 2 کروڑ 79 لاکھ 45 ہزار ایکڑ سے بڑھ کر 2 کروڑ 93 لاکھ 63 ہزار اور گندم کا زیر کاشت رقبہ ایک کروڑ 49 لاکھ 67 ہزار سے بڑھ کر ایک کروڑ 56 لاکھ 89 ہزار ہو گیا۔ جس کے یہ معنی ہوئے کہ پیداوار میں اضافہ کا سبب سبز انقلاب نہیں بلکہ کاشت کے لیے نئی زمینوں کا استعمال ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ کھادوں کے استعمال اور آبپاشی میں اضافہ کے باعث فی ایکڑ پیداوار میں بھی اضافہ ہوا تو یہ غلط نہیں لیکن اس کی قیمت کیا ادا کرنی پڑی؟

تیسرے منصوبہ کے خاتمہ تک پاکستان میں 22 ہزار فی ٹن سپر فاسفیٹ 57 ہزار ٹن امونیم سلفیٹ اور دو لاکھ 97 ہزار ٹن اریا کی کھاد تیار کی گئی۔ اس کے علاوہ بیرونی ممالک سے بھی کھاد درآمد ہوئی۔ یہ کھاد اتنی مہنگی تھی کہ اس کی فروخت پر حکومت کو مغربی پاکستان میں 35 فیصد اور مشرقی پاکستان کو 52ء57 فیصد "امدادی رقم" دینا پڑی جو 65-1964ء میں چار کروڑ نوے لاکھ روپے سے بڑھ کر 70-1969ء میں 13 کروڑ 40 لاکھ روپے ہو گئی۔ اسی طرح پودوں کو کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رکھنے کے لیے کروڑوں روپے کی ادویہ برآمد کی گئیں۔ پھر آلاتِ کشاورزی اور آبپاشی پر بھی بے پناہ خرچ ہوا۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ گندم' چاول اور دوسری تمام غذائی اجناس کی لاگت میں اضافہ کے باعث نرخ بھی آسمان سے باتیں کرنے لگے۔

66-1965ء میں گندم کی اوسط قیمت پندرہ سولہ روپے من تھی۔ لیکن بڑھتے بڑھتے 70-1969ء میں 22

روپے ہوگئی اور اب تیس روپے تک پہنچ چکی ہے۔ اسی طرح درمیانہ درجہ کا چاول ستائیس اٹھائیس روپے من تھا لیکن 68-1967ء میں 50 روپے تک پہنچ گیا۔ مشرقی پاکستان سے رشتہ منقطع ہونے کے بعد ہزاروں ٹن چاول فالتو پڑا ہے لیکن قیمتوں میں تخفیف کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ وجہ ظاہر ہے' سبز انقلاب کی برکت سے اناج کی پیداوار کا لاگت میں اتنا اضافہ ہوا ہے کہ قیمتوں کو قابو میں رکھنا ممکن نہیں رہا۔

مہنگائی اور بے روزگاری

ابتدا میں کہا گیا تھا کہ فالتو اناج برآمد کیا جائے گا لیکن بیرونی ممالک میں گندم کی قیمت گیارہ روپے من اور چاول کی 25 روپے من ہے اس لیے پاکستان کی گراں قیمت پیداوار کے فروخت ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پاکستان میں جو اناج اگایا جا رہا ہے جب وہ درون ملک کی ضروریات کے لیے کافی نہیں تو بیرون ممالک کے لیے کہاں سے آئے گا۔ صدر ایوب کے عہد میں اس زمانہ کے وزیر زراعت (مغربی پاکستان) یہ کہتے نہیں تھکتے تھے کہ ہم عنقریب لاکھوں من گندم ترکی اور دوسرے ممالک کو بھجوا رہے ہیں۔ لیکن کسی نے نہ پوچھا کہ بھلے مانس' اگر تمہارے پاس فالتو اناج ہے تو باہر سے دھڑا دھڑ کیوں منگوا رہے ہو؟ وزارت زراعت اور مرکزی دفتر شماریات کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان نے بیرونی ممالک سے جو گندم' چاول اور چینی درآمد کی وہ ذیل کے نقشہ سے ظاہر ہے۔

سال	گندم	چاول	چینی	
1966-67ء	17,70,803	1,90,799	269	ٹن
1967-68ء	21,20,549	1,50,227	8,164	ٹن
1968-69ء	7,54,753	66,000	2,57,419	ٹن
1969-70ء	11,07,369	1,19,929	13,292	ٹن

ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ سب سے زیادہ گندم' چاول اور چینی کی درآمد عین اس سال ہوئی جب ریڈیو' اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ گلا پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہے تھے کہ پاکستان ایک "سبز انقلاب" سے دوچار ہو چکا ہے اور دیہات میں روپے پیسے کی اتنی ریل پیل ہے کہ اسے اکٹھا کرنے کے لیے تمام بنکوں کو اپنی شاخیں ملک بھر میں پھیلا دینی چاہئیں۔

واقعہ یہ ہے کہ "سبز انقلاب" سے ملک کو معاشی بدحالی' بے روزگاری اور مہنگائی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ حال ہی میں سمندر پار ترقیاتی کونسل کے ایک ایسوسی ایٹ میکوڈی اے شاہ نے "روزگار اور زرعی ترقی" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا ہے جس میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ معجز نما بیجوں سے چونکہ پیداوار بڑھ گئی ہے اس لیے ترقی پذیر ممالک میں مزدوروں کی مانگ میں بھی 20 سے 50 فیصد تک اضافہ ہوا ہے۔ جہاں تک پاکستان کا

تعلق ہے اعداد و شمار اس دعویٰ کی تصدیق نہیں کرتے۔ 1960ء سے 1970ء کے ڈھاکہ میں ٹریکٹروں کی تعداد تین سو سے بڑھ کر بیس ہزار ضرور ہوگئی لیکن اس کے مقابلہ میں مزدوروں کی مانگ میں بھی پچاس فیصد تخفیف ہوئی۔ پاکستان میں 25 ایکڑ سے بڑے کھیتوں میں جن کا مجموعی رقبہ دو کروڑ ایکڑ سے کم نہیں 12 لاکھ مزدور کام کرتے ہیں۔ اس لیے خطرہ ہے کہ اگر مشینی کاشت میں برابر کا اضافہ ہوتا رہا تو اگلے پندرہ سال میں کم از کم چھ سات لاکھ مزدور بے روزگاری کا شکار ہو جائیں گے۔ مسٹر شاہ نے کہا ہے کہ فالتو مزدور ان ذیلی صنعتوں میں کھپ جائیں گے جو زرعی ترقی کے نتیجہ میں قائم ہوں گی۔ مثال کے طور پر بھارت میں ڈبل روٹی بنانے والے کارخانوں میں 758ء92 ایسے مزدور کام کرنے لگے ہیں جو مشینی کاشت کے نتیجہ میں بیکار ہوئے تھے۔ اسی طرح انہوں نے ڈسکہ (سیالکوٹ) میں ڈیزل انجن کی صنعت کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ اس میں ایک ہزار سے زائد مزدور نہیں کھپ سکے۔

غرض جہاں تک اس دعویٰ کا تعلق ہے کہ "سبز انقلاب" سے پیداوار میں اضافہ ہوا ہے پاکستان کے تجربہ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ مشرقی پاکستان میں یہ انقلاب اس لیے ناکام رہا کہ آبپاش رقبہ میں بارش کی کثرت کے باعث پانی کو انضباط میں رکھنا ناممکن ہوگیا' مغربی پاکستان میں موٹے چاول اور میکسی پاک کی پیداوار میں پہلے سال ضرور اضافہ ہوا' لیکن اس کا فائدہ بڑے زمینداروں کے سوا کسی کو نہیں پہنچ سکا۔ غذائی اعتبار سے یہ دونوں اجناس اتنی گھٹیا ثابت ہوئیں کہ عوام نے ان کو مسترد کر دیا ہے اور وہ حتی الوسع بلیک سے دیسی گندم اور باسمتی چاول خرید کر گزارا کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ پسند نہیں کرتے کہ ان کو اری چاول یا میکسی پاک گندم کھانے کو ملے۔ زمیندار بھی یہ دونوں فصلیں محض مجبوری کے تحت بو رہے ہیں ورنہ ان کو کرم کش ادویہ اور کیمیاوی کھاد کے استعمال نے اس درجہ پریشان کر رکھا ہے کہ وہ چاول اور گندم کی بجائے کوئی نقد آور فصل (مثلاً گنا' کپاس' پٹ سن) بونے کو ترجیح دیتے ہیں۔ جہاں تک گندم اور چاول سے زرمبادلہ کمانے کا تعلق ہے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ نہ تو برآمد کے لیے فالتو اجناس ہے نہ قیمتوں کے لحاظ سے ان کا عالمی بازار میں کوئی مقابلہ ہے۔

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ "سبز انقلاب" کے نتیجہ میں گیہوں اور چاول کی پیداوار بے شک بڑھ جاتی ہے لیکن اس سے زرعی نظام میں بہت سے ایسے عیوب پیدا ہو جاتے ہیں جن کا تدارک زرعی انقلاب کے سوا کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ مثلاً تجربہ بتاتا ہے کہ "سبز انقلاب" کے بعد اکثر مالکان اراضی اپنے مزارعین کو بے دخل کرنا شروع کر دیتے ہیں تاکہ تمام منافع وہ خود ہڑپ کر سکیں۔ اسی طرح بعض مالکان اراضی "لگان" بڑھا دیتے ہیں۔ ادھر چونکہ زراعت کاری تاجر پیشہ لوگوں کے لیے نفع بخش ہو جاتی ہے اس لیے وہ قیمتوں میں آگ لگانے سے دریغ نہیں کرتے۔ اسی طرح سبز انقلاب سے پیداوار ہی نہیں بڑھتی آمدنیوں میں تفاوت بھی بڑھ جاتا ہے۔ بڑے زمیندار تو کھاد' کرم کش ادویہ' گوداموں اور پانی کی فراہمی پر اپنا سرمایہ لگا کر بے دریغ منافع کما سکتے

ہیں لیکن مفلوک الحال دہقان' بے زمین کاشت کار اور مزدور کیا کریں؟ ان کے لیے یہ تمام تکنیکی ترقی بے معنی اور بیکار ہوتی ہے۔ وہ قدرتی طور پر اپنے افلاس کا ذمہ دار بڑے زمینداروں کو ٹھہراتے ہیں اور اس طرح معاشرتی کشیدگی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ بین الاقوامی ادارے (آئی ایل او اور ایف اے او) اس صورت حال پر غور کر چکے ہیں لیکن وہ بھی اس کے سوا کوئی علاج تجویز نہیں کر سکے کہ معجز نما بیج ارزاں نرخ پر براہ راست چھوٹے کاشت کاروں اور مزارعوں کو فراہم کیے جائیں۔ لیکن یہ حل بھی اس وقت تک معقول نہیں کہلا سکتا جب تک کاشت کاروں اور مزارعوں کو زمین کا مالک بھی نہ بنایا جائے۔ دراصل بات یہ ہے کہ سرمایہ دار ملک "سبز انقلاب" کو "زرعی انقلاب" کا "بدل" بنانا چاہتے ہیں جس میں وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ "سبز انقلاب" سے چونکہ معاشی عدم مساوات اور معاشرتی کشیدگی میں اضافہ ہوتا ہے اس لیے وہ "زرعی انقلاب" کی جگہ نہیں لے سکتا۔

صدر ایوب کی اصلاحاتِ اراضی

پاکستان میں "سبز انقلاب" کا دوسرا مرحلہ حد ملکیت کو انصاف کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا تھا۔ اس لحاظ سے بھی صدر ایوب کی اصلاحات فریب ثابت ہوئیں۔ ان کے "اصلاحات اراضی کمیشن" نے سفارش کی کہ کسی شخص کو نہری علاقہ میں پانچ سو اور غیر نہری علاقہ میں ایک ہزار ایکڑ سے زیادہ زمین رکھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ لیکن بعض مستثنیات ایسی تجویز کیں کہ تمام اصلاحات کا اثر زائل ہو کر رہ گیا۔ مالکان اراضی کو اس بات کی اجازت دے دی گئی کہ وہ فالتو زمین میں یا تو باغات لگالیں یا شکار گاہوں میں تبدیل کرلیں یا اپنے عزیز و اقارب کو تحفہ میں دے دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پرنالہ وہیں کا وہیں رہا۔ بڑے زمیندار اور بھی بڑے زمیندار بن گئے اور چھوٹے کاشت کاروں کے حقوق کا تحفظ نہ ہو سکا۔ اول تو صرف پانچ ہزار افراد نے اپنے رقبے کا اعلان کیا جو 55 لاکھ ایکڑ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ حالانکہ تمام بڑے زمیندار صحیح صورت حال بتاتے تو یہ رقبہ 74 لاکھ ایکڑ ہونا چاہیے تھا۔ بایں ہمہ ظاہر کردہ رقبہ میں سے 24 لاکھ ایکڑ قیمتاً حکومت کے حوالے کیے گئے جس میں سے صرف ساڑھے سات لاکھ ایکڑ رقبہ دو لاکھ کاشت کاروں میں تقسیم ہوا۔ چار لاکھ بیس ہزار ایکڑ بڑے زمینداروں نے اپنے وارثوں اور رشتہ دار خواتین کو دے دیے اور آٹھ لاکھ پچاس ہزار ایکڑ زمین یا تو نیلام کر دی گئی یا سرکاری محکموں کی تحویل میں چلی گئی یا بڑے زمینداروں کو شکار گاہیں بنانے کے لیے دے دی گئی۔ اس طرح صدر ایوب کی حکومت کے خاتمہ تک ساڑھے سات لاکھ ایکڑ ایسے بچ گئے جن کے بارے میں صدر بھٹو کے برسر اقتدار آنے تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ صدر ایوب کی اصلاحات سے بیس لاکھ کاشت کاروں کو کسی حد تک فائدہ پہنچ سکا۔ جہاں تک بڑے زمینداروں کا تعلق ہے وہ پھر بھی اپنی 67 فیصد زمین پر قابض رہے۔ جو زمین انہوں نے حکومت کے حوالے کی وہ ناکارہ اور گھٹیا تھی۔ یہی وجہ ہے کہ 24 لاکھ

ایکڑ میں سے صرف چار لاکھ ساٹھ ہزار ایکڑ زمین کاشت کاروں نے خریدی باقی 32 فیصد زمین اگر ابھی تک قابل فروخت پڑی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ناقابل فروخت ہے۔ پھر جو زمین شکار گاہوں کے لیے وقف کی گئی ہے وہ حاصل کردہ زمین کا 18 فیصد ہے اور اس کا شمار زرخیز ترین اراضی میں ہوتا ہے۔ اس طرح بڑے زمیندار کسی صورت میں بھی خسارے میں نہیں رہے۔ ایک طرف انہوں نے ناکارہ زمین منہ مانگے داموں فروخت کر دی دوسری طرف بہترین زمین پر قابض رہے اور شکار گاہیں اور باغات مفت ہاتھ میں آگئے۔ پھر ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ جو رقبہ زمینداروں سے قیمتاً خریدا گیا وہ پھر زمینداروں اور سرکاری افسروں میں تقسیم کر دیا گیا۔ چنانچہ کم از کم دو لاکھ ایکڑ رقبہ ایسا تھا جو صرف 66 افراد کو بلا کرایہ پٹہ پر دے دیا گیا۔ اس طرح غائب باش زمینداروں کا ایک نیا طبقہ پیدا ہو گیا جس نے مزارعت کے مسئلہ کو اور بھی الجھا دیا۔ بڑے زمینداروں کی اکثریت ایسی ہے جس نے مالکانہ حقوق قومی غداری کے عوض انگریز سے حاصل کیے تھے۔ اس لیے چاہیے تو یہ تھا کہ تمام زمینیں بلا معاوضہ چھین لی جائیں لیکن زرعی اصلاحات کمیشن نے ان کا معاوضہ پیداواری صلاحیت کے لحاظ سے مقرر کیا جس سے مالکانِ اراضی نے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ دوسرے اس معاوضہ کو سرکاری کفالتوں میں منتقل کرنے کی اجازت کے باعث ان کو ایک طویل مدت تک معقول آمدنی کا ذریعہ میسر آگیا۔ حصول اراضی کے بعد چونکہ زرعی پیداوار اور زمین دونوں کی قیمتوں میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے اس لیے بڑے زمیندار خسارے میں نہ رہے بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ امیر اور خوشحال ہو گئے۔

زرعی انقلاب کا پیش خیمہ

صدر بھٹو نے "زرعی اصلاحات" کا اعلان کیا تو قدرتی طور پر نام نہاد "سبز انقلاب" کی یہ تمام قباحتیں اور خرابیاں ان کے پیش نظر تھیں۔ انہوں نے حد ملکیت کے سوال کو معاشرتی انصاف کے فلسفہ کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ پاکستان میں صرف ایک لاکھ مالکان اراضی ایسے ہیں جن کے پاس 25 ایکڑ سے زائد رقبہ ہے اور ان میں سے بعض کا رقبہ چالیس چالیس پچاس پچاس ہزار ایکڑ سے بھی زائد ہے۔ ان کے مقابلہ میں 92 فیصد زمینداروں کے پاس مجموعی رقبہ کا صرف 57 فیصد ہے اور وہ بھی چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں بٹا ہوا ہے جن پر کاشت کاری کسی صورت میں بھی نفع بخش ثابت نہیں ہو سکتی۔ ملکیت اراضی کی اس غیر مساویانہ تقسیم کا اثر لازمی طور پر پیداوار پر پڑتا ہے۔ بڑے زمیندار اپنے پورے رقبہ کو کاشت میں نہیں لاتے بلکہ وہ خزانے پر سانپ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی اکثریت غائب باش ہے۔ وہ دیہات کی بجائے شہروں میں بود و باش رکھتے ہیں۔ ان کی دلچسپی کھیت سے زیادہ سیاست اور افسر شاہی سے وابستہ ہوتی ہے۔ مزارعوں کو چونکہ حق ملکیت حاصل نہیں ہوتا اس لیے ان کی محنت کا 75 تا 90 فیصد ثمرہ مالکان اراضی اٹھا کر لے جاتے ہیں اور وہ کبھی پوری دلجمعی سے کام نہیں لیتے۔ اسی صورت حال سے متاثر ہو کر گلبرتھ نے "معاشی ترقی کا مطالعہ" میں لکھا

PakDigestNovels.Blogspot.Com

تھا:

"سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستان میں (یا کہیں بھی) کوئی کسان عمدہ بیجوں کے ذریعے اپنی آمدنی میں اضافہ کیوں کرے۔ جب وہ جانتا ہے کہ اس کی تمام پیداوار محکمہ مال گزاری اور بڑا زمیندار اٹھا کر لے جائے گا اور اس کے پاس سال بھر کی روٹی کے لیے کچھ نہ رہے گا۔ اس اندیشہ کو دور کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اس کے پاس وافر اور اپنی زمین ہو تاکہ وہ اپنی محنت کا پھل خود کھا سکے"۔

پیداواری اشاریہ

صدر بھٹو نے تقسیم اراضی کے اس غیر منصفانہ اور غیر معاشی تفاوت کو دور کرنے کے لیے یہ قرار دیا ہے کہ کوئی شخص نہری علاقہ میں ڈیڑھ سو ایکڑ اور غیر نہری علاقہ میں تین سو ایکڑ سے زیادہ زمین اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ زائد زمین کاشتکاروں اور مزارعوں میں تقسیم کر دی جائے گی۔ حد ملکیت کے تعین کے لیے معیار حسب سابق "پیداواری اشاریہ" کو بنایا گیا ہے۔ پیداواری اشاریہ اس طرح نکالا جاتا ہے کہ مجموعی پیداوار کو رقبہ پر تقسیم کر کے اسے اضلاعی عدد متناسبہ سے ضرب دے دی جاتی ہے۔ اضلاعی عدد متناسبہ زمین کی زرخیزی کے مطابق ہر علاقے کا جداگانہ ہے۔ مثال کے طور پر لاہور کے قرب و جوار میں ایک مربع یا 25-ایکڑ زمین میں اگر ایک ہزار من گندم پیدا ہوتی ہے تو ایک ہزار کو 25 پر تقسیم کر کے 2 سے ضرب دی جائے تو پیداواری اشاریہ نکل آتا ہے۔ اس طرح لاہور کا اشاریہ 80 ہے' لیکن لائل پور' منٹگمری یا اوکاڑہ اور حیدر آباد کا اشاریہ اس سے مختلف ہو گا کیوں کہ لاہور کی زمین کے بارے میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ زرخیزی کے لحاظ سے وہ دوگنا ہے لیکن لائلپور کی پیداوار اس سے بھی زیادہ ہے۔ اسی طرح ہر ضلع کا اشاریہ جداگانہ ہے۔ پیداواری اشاریہ نکالنے کا یہ طریقہ 1948ء کے بعد (جب موجودہ بندوبست ہوا) اختیار کیا گیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ موجودہ حالات میں یہ اشاریہ فرسودہ ہو چکا ہے۔ زرخیزی اور قیمت کے لحاظ سے اس پر نظر ثانی ہونی چاہیے۔ تاہم جو لوگ یہ اعتراض کر رہے ہیں کہ اس اشاریہ کو معیار بنانے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ بعض مقامات پر تو زمینداروں کے پاس ڈیڑھ سو ایکڑ رہ جائیں گے اور بعض کے ہاتھ ساڑھے چار سو ایکڑ آئیں گے۔ ان کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مقصد اراضی اور آمدنی کو ایک حد کے اندر رکھنا تھا۔ یہ مقصد اس طریقہ سے بوجوہ احسن پورا ہو جاتا ہے۔ اصلاحات سے پہلے ملکیت غیر محدود تھی۔ صدر ایوب نے اسے محدود کرنا چاہا' لیکن مستثنیات کے باعث وہ پھر غیر محدود رہی۔ صدر بھٹو کی اصلاحات نے چونکہ مستثنیات کی گنجائش نہیں رکھی اس لیے ملکیت محدود ضرور ہو جائے گی۔ اس میں زمین کی نوعیت کے لحاظ سے تھوڑا بہت تفاوت رہے تو اس سے آمدنی میں فرق نہیں پڑتا۔

زرعی آمدنیوں کا معیار

دیکھنا یہ چاہیے کہ ملکیت کو ایک حد کے اندر رکھنے سے زرعی آمدنی بھی ایک حد کے اندر آ گئی یا نہیں؟ پنجاب بورڈ آف اکنامک انکوائری نے آج سے چند سال پیشتر زرعی آمدنیوں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ مالک کاشت کاروں کی بالمقطع سالانہ آمدنی نہری علاقوں میں 347 روپے اور بارانی علاقوں میں 118 روپے ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ نہری علاقوں میں کسی کے پاس پانچ سو ایکڑ (20 مربع) ہوں تو اس کی بالمقطع سالانہ آمدنی ایک لاکھ تہتر ہزار پانچ سو روپے ہو گی' یا یوں کہئے کہ وہ ساڑھے چودہ ہزار روپے ماہوار کمائے گا۔ اسی طرح بارانی علاقوں میں ایک ہزار ایکڑ سے ایک لاکھ اٹھارہ ہزار روپے کی بالمقطع سالانہ (یا 980 روپے ماہوار) آمدنی ہوتی ہے۔

ظاہر ہے یہ آمدنی شہری آمدنیوں کے اوسط سے بہت زیادہ ہے۔ مغربی پاکستان میں فی کس سالانہ آمدنی سات سو روپے سے زیادہ نہیں۔ گویا ایک خاندان سال بھر میں بمشکل 3850 روپے کماتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اگر دیہات میں کوئی خاندان 1,73,500 روپیہ یا 1,18,000 روپیہ سالانہ کماتا ہے تو ظاہر ہے یہ ایک ایسا معاشرتی ظلم ہے جس کو کسی صورت برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن صدر ایوب نے حد ملکیت پانچ سو اور ایک ہزار مقرر کر کے یہ ظلم روا رکھا۔ صدر بھٹو نے اس ظلم کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اول تو انہوں نے ملکیت خاندان کی بجائے افراد کے ہاتھ میں دے دی ہے جس کا فائدہ یہ ہو گا کہ دولت کا ارتکاز نہیں ہو سکے گا بلکہ انتشار رہے گا۔ ایک ہی خاندان کے افراد میں اتحاد ضروری نہیں ہوتا۔ باپ بیٹے کے خلاف ہو سکتا ہے۔ خصوصاً سیاست میں نقطۂ نگاہ مختلف ہو سکتا ہے۔ اس لیے زمین کنبہ کے ہاتھ میں دینے کی بجائے اس کے ارکان میں بانٹ دی جائے تو یہ زیادہ قرین انصاف ہے اور اس سے بہت سی خاندانی مشکلات اور قانونی پیچیدگیوں کا ازالہ ہو جائے گا۔ چند سال بعد جب یہ زمین ورثا میں تقسیم ہو گی تو مالکانہ زور خود بخود ٹوٹ جائے گا۔ دوسرے ملکیت کا معیار پیداواری اشاریہ ہے نہ کہ رقبہ۔ نہری رقبہ ڈیڑھ سو ایکڑ ہو یا تین سو یا چار سو' پیداواری اشاریہ پندرہ ہزار رہے گا۔ پنجاب بورڈ آف اکنامک انکوائری کی تحقیق کے مطابق پیداواری اشاریہ کے ایک واحد یونٹ سے چار یا پانچ روپے بالمقطع آمدنی ہوتی ہے اس کے یہ معنی ہوئے کہ جس شخص کے پاس نہری علاقہ میں ڈیڑھ سو یا غیر نہری علاقہ میں تین سو ایکڑ زمین ہے اس کی بالمقطع آمدنی کم از کم ساٹھ ہزار روپے سالانہ ہو گی۔ گویا پانچ ہزار روپیہ ماہوار۔ اس آمدنی پر چونکہ انکم ٹیکس کی تجویز بھی زیر غور ہے اس لیے ظاہر ہے کہ دیہات میں آمدنیوں کا معیار بھی قریب قریب وہی ہو جائے گا جو شہروں میں صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے کے بعد متوقع ہے۔ موجودہ حالات میں بھی صدر بھٹو کی اصلاحات کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ کم از کم زرعی آمدنیوں کی تحدید ہو گئی۔ پہلے اگر لاکھوں روپے کا تفاوت تھا تو اب چند ہزار کا رہ گیا۔ رفتہ رفتہ یہ فرق بھی دور ہو جائے گا اور آمدنیوں کی سطح بڑی حد تک ہموار ہو جائے گی۔

مزارع ومالک کے تعلقات

حد ملکیت مقرر کرنے کے بعد مالک اور مزارع کے تعلقات کا سوال آتا ہے۔ پاکستان میں 21 لاکھ کے قریب مزارع محض ہیں جو ایک کروڑ 92 لاکھ ایکڑ پر کاشت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ آٹھ لاکھ ایسے مزارع ہیں جو چھوٹی چھوٹی زمینوں کے مالک بھی ہیں۔ اب تک جتنی اصلاحات نافذ کی گئی ہیں ان کا مقصد بڑے زمینداروں کے مفاد کے تحفظ کے سوا کچھ نہ تھا۔ موروثی مزارعوں کو مالکانہ حقوق دیے گئے لیکن شرط چونکہ یہ تھی کہ جو مزارع تین چار سال تک کسی زمین پر ہل جوتے وہ مالک بن جائے گا اس لیے بڑے بڑے زمیندار یہ شرط کبھی پوری نہیں ہونے دیتے تھے اور چار سال سے پہلے ہی اسے بے دخل کر دیتے تھے۔ اس کے علاوہ کھیتی باڑی کے مصارف تو مزارع دیتا تھا لیکن فصل مالک آکر اٹھا لے جاتا تھا۔ بظاہر بٹائی کا تناسب ساٹھ اور چالیس تھا لیکن بیگار، خرچہ، منشیانہ، کمیانہ، کرایہ اور اسی قسم کے بے شمار نذرانے اور جرمانے ادا کرنے کے بعد مزارع کو بالفصل 75 تا 90 فیصد آمدنی مالک کے حوالے کرنا پڑتی تھی۔ صدر بھٹو نے مالک اور مزارع کے تعلقات کو خوشگوار بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے ایک تو یہ قرار دیا ہے کہ بیج کے اخراجات مالک دے گا اور باقی مصارف مالک و مزارع مساویانہ ادا کریں گے۔ جہاں تک ٹیکسوں کا تعلق ہے وہ بھی مالک کو ادا کرنے ہوں گے۔ پھر مالک اگر اراضی کو فروخت کرنا چاہے تو خریدنے کا پہلا حق مزارع کو ہوگا۔ اس طرح مزارع کا بوجھ بڑی حد تک ہلکا ہوگیا ہے اور اب وہ پوری محنت اور دلجمعی سے کام کر سکے گا۔ جہاں تک چھوٹے کاشت کاروں اور زرعی مزدوروں کا تعلق ہے اول تو ان کو زمین خریدنے کا حق ہے، دوسرے ان کی بہتری و بہبود کے لیے بہت سی ترقیاتی سکیمیں نافذ کی جا رہی ہیں۔ ان سے وہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی زرعی اصلاحات نے سبز انقلاب کے ڈھونگ کو ختم کر کے ایک ایسے نظام کی بنیاد رکھ دی ہے جس کے خاکہ میں خلوص نیت سے رنگ عمل بھرا جائے تو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایسا تاریخی عمل شروع ہو جائے گا جو چند ہی سال کے اندر زرعی انقلاب برپا کر سکتا ہے۔ لہٰذا دیکھنا یہ ہے کہ جو پروگرام پیش کیا گیا ہے اس پر عمل کس طرح کیا جاتا ہے؟

PakDigestNovels.Blogspot.Com

باب 37

تصریحات اور گوشوارے

1- عوامی زرعی اصلاحات
2- چند تصریحات
3- زرعی اصلاحات سے متاثرہ رقبے
4- زرعی فارموں کی نوعیت، تعداد اور رقبے
5- زرعی اصلاحات 1972ء- زرعی مزدوروں کی تعداد
6- پیداواری اشاریہ مختلف اضلاع میں

عوامی زرعی اصلاحات

بڑے زمینداروں سے جو زمین لی جائے گی وہ بے زمین کاشتکاروں کو دے دی جائے گی۔

آبیانہ، مالیانہ، بیج کی قیمت اور سارے ٹیکس مزارع یا ہاری نہیں بلکہ زمینوں کے مالک (زمیندار) ادا کریں گے۔

کوئی فرد ڈیڑھ سو ایکڑ نہری اور تین سو ایکڑ بارانی زرعی زمین سے زیادہ زمین نہیں رکھ سکے گا۔

اس مقررہ حد سے زیادہ زمین زمینداروں سے بلا معاوضہ حاصل کر کے غریب کسانوں میں مفت تقسیم کر دی جائے گی۔

آئندہ کوئی زمیندار مزارعین سے نہ بلا معاوضہ خدمت لے سکے گا اور نہ جبری لگان وصول کر سکے گا۔

کسانوں کی ایک طرفہ اور ظالمانہ بے دخلی کی کارروائیاں فوراً بند کر دی گئی ہیں۔

بیراجوں کی نئی زمینیں ایک سو ایکڑ چھوڑ کے سرکاری افسروں سے واپس لے لی جائیں گی۔ دوسرے علاقوں میں بھی سرکاری ملازمین کے لیے ملکیت کی یہی حد ہوگی۔

دفاعی افواج کے لیے مناسب زمین مخصوص ہوگی۔

چند تصریحات

جناب غلام مصطفیٰ جتوئی، وزیر سیاسی امور نے پریس کانفرنس میں صحافیوں کے سوالات کے جواب میں کہا:

1- بے زمین کاشتکاروں کو واپس لی ہوئی زمینوں کا مالک بنانے کی کارروائی زمینداروں کے گوشواروں کی چھان بین کے بعد شروع ہوگی اور یہ سکیم یکم جولائی سے عمل میں آئے گی۔

2- گورنمنٹ کا عزم ہے کہ ہر بے زمین کاشت کار کو گزارہ یونٹ پنجاب اور سرحد میں ساڑھے بارہ ایکڑ اور سندھ میں 16-ایکڑ نہری علاقوں میں اور 32-ایکڑ بارانی زمین ہر صوبے میں دی جائے۔

3- زمینداروں سے واپس لی جانے والی زمین کی مقدار اور بے زمین کاشت کاروں کی تعداد کا حساب اب لگایا جائے گا۔ اس سے قبل یہ کام اس لیے نہیں شروع کیا گیا کہ زرعی اصلاحات کی بنیادی باتیں قبل از وقت عام نہ ہو جائیں۔

4- یہ اصلاحات بنیادی ہیں اور اسمبلی کو پورا اختیار ہوگا کہ وہ مزید اصلاحات پر غور کرے۔

5- جن افسروں نے دفاعی پٹی میں زمینیں حاصل کی تھیں اور بعد کو اندرونی محفوظ علاقوں سے ان کا تبادلہ کر لیا ان کے نام عوام کی اطلاع کی غرض سے شائع کیے جائیں گے۔

6- جن شکار گاہوں کو حکومت کے زیر انتظام رکھنا تجویز کیا گیا ہے ان کے بارے میں حکومت چھان بین کرے گی اور خاص طور سے جنگلی جانوروں کی زندگی اور نسلوں کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے مسئلہ کا جائزہ لے گی۔ ان کے علاوہ دوسری شکار گاہوں کی زمین کاشت کاروں میں تقسیم کر دی جائے گی۔

7- جو متروکہ زمین پٹے پر دی گئی ہے وہ بھی مقررہ حد یعنی پندرہ سو یونٹ کے علاوہ حکومت واپس لے لے گی۔

8- درگاہوں اور مزاروں سے تعلق رکھنے والی زمین بھی ان اصلاحات کے تحت آئے گی۔

9- بہت سی سرکاری زمین بھی موجود ہے جو کاشتکاروں کو دی جائے گی۔ چھ لاکھ پچیس ہزار ایکڑ ایسی زمین سندھ کے بیراجوں کے علاقے میں ہے اور چالیس لاکھ پٹ فیڈر کے علاقے میں ہے۔

صدر وضاحت کر چکے ہیں کہ موجودہ اصلاحات کے تحت ہر شخص زیادہ سے زیادہ 18 ہزار یونٹ زمین اپنے پاس رکھ سکے گا بمقابل اس رقبے کے جو 1959ء کے اصلاحات کے تحت ورثاء کو منتقل کرنے کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ 150 ایکڑ کی حد اس اضافی رقبے کے مساوی ہے جو سابقہ زرعی اصلاحات میں باغات کے لیے رکھا گیا تھا۔ جو حد موجودہ اصلاحات میں مقرر کی گئی ہے اس کے نتیجے میں زمینداروں کے پاس موجودہ زمین کا فقط تیس فیصد حصہ باقی رہ جائے گا۔

زرعی اصلاحات سے متاثرہ رقبے

17 دسمبر 1972ء کی ایک اطلاع کے مطابق اراضی کی تقسیم پنجاب اور سندھ میں 31 دسمبر تک اور سرحد اور بلوچستان میں 31 مارچ تک ختم ہو جائے گی۔

عوامی زرعی اصلاحات کے تحت جو زمین چاروں صوبوں میں واگزار ہوتی ہے وہ درج ذیل ہے:

پنجاب	19,36,488	ایکڑ
سندھ	10,60,739	ایکڑ
سرحد	2,98,890	ایکڑ
بلوچستان	7,68,833	ایکڑ

مغربی پاکستان میں قابل کاشت رقبہ 7 کروڑ 90 لاکھ ایکڑ اور زیر کاشت رقبہ 6ء47 لاکھ ایکڑ ہے۔

گزشتہ زراعت شماری کے مطابق اس رقبہ پر پچاس لاکھ خاندان آباد ہیں۔ ان میں سے اکثریت چونکہ مزارعین کی ہے اس لیے بڑے زمینداروں سے زمین لے کر انہی میں تقسیم کی جائے گی۔

"اراضی کمیشن" کے اعداد و شمار کے مطابق چھ سو بڑے زمینداروں کے پاس جتنی زمین ہے اتنی تیس لاکھ کاشتکاروں کے پاس اجتماعی طور پر بھی نہیں ہے۔ اندازہ ہے کہ بڑے زمیندار 71 لاکھ ایکڑ زمین پر قابض ہیں۔ زرعی اصلاحات کے مطابق اسی میں سے نصف کے قریب زمین لے کر کاشت کاروں میں تقسیم کی جائے گی۔ اب تک چالیس لاکھ ایکڑ زمین واگزار ہو چکی ہے۔

زرعی اصلاحات 1972ء

متاثرہ رقبہ

(الف) مارشل لا 1964ء کے تحت واگزار رقبہ: تقریباً دس لاکھ ایکڑ۔

(ب) مارشل لا 1972ء کے تحت واگزار رقبہ (1500 پیداواری یونٹ کے حساب سے): ایک لاکھ ایکڑ سے زائد۔

(ج) مارشل لا 1972ء کے تحت واگزار رقبہ (1200 پیداواری یونٹ کے حساب سے): تقریباً ایک لاکھ ایکڑ۔

(د) زرعی اصلاحات 1972ء کے تحت مجموعی واگزار رقبہ: اندازاً دو لاکھ ایکڑ۔

متاثرہ مالکانِ اراضی

(الف) مارشل لا 1964ء کے تحت متاثرہ مالکان اراضی: تقریباً تین سو۔

(ب) پندرہ سو پیداواری اشاریہ یونٹ کی بنیاد پر متاثرہ مالکان اراضی: تقریباً پانچ سو۔

(ج) بارہ سو پیداواری اشاریہ یونٹ کی بنیاد پر مزید متوقع متاثرہ مالکان اراضی: تقریباً چھ سو۔

(د) زرعی اصلاحات 1972ء کے تحت مجموعی متاثرہ مالکان اراضی: تقریباً گیارہ سو۔

متاثرہ مزارعین

(الف) 1964ء کی اصلاحات اراضی کے تحت مستفید مزارعین: تقریباً اڑھائی ہزار۔

(ب) پندرہ سو پیداواری اشاریہ یونٹ کے تحت مستفید مزارعین: تقریباً دس ہزار۔

(ج) بارہ سو پیداواری اشاریہ یونٹ کے تحت متوقع مستفید مزارعین: تقریباً سات ہزار۔

(د) زرعی اصلاحات 1972ء کے تحت مستفید مزارعین: تقریباً سترہ ہزار۔

نوٹ: 1972ء کی زرعی اصلاحات کے تحت جو رقبہ واگزار کیا گیا ہے وہ 1959ء کی بہ نسبت کہیں زیادہ زرخیز ہے اس لیے مزارعین کو حقیقی قیمت کے لحاظ سے بھی فائدہ رہے گا۔ 1959ء میں دس لاکھ ایکڑ رقبہ واگزار ہوا لیکن اس میں بھی صرف سات لاکھ ایکڑ (یعنی ستر فیصد) تقسیم ہو سکا۔

زرعی فارموں کی نوعیت، تعداد اور رقبہ

علاقہ	زرعی فارموں کی نوعیت	تعداد	رقبہ ایکڑوں میں
مغربی پاکستان	کل فارم	48,59,983	4,89,29,583
	خود کاشت فارم	19,97,736	1,87,22,915
	وہ فارم جن میں مالک اراضی کے علاوہ دوسری اراضی بطور مزارع بھی کاشت کرتے ہیں۔	8,34,257	1,10,11,594
	وہ فارم جو محض مزارعین کے زیر کاشت ہیں۔	2,02,790	1,91,95,083
صوبہ سرحد	کل فارم	6,74,389	54,63,720
	خود کاشت فارم	3,25,066	18,70,572
	وہ فارم جن میں مالک اپنی اراضی کے علاوہ دوسری اراضی بطور مزارع بھی کاشت کرتے ہیں۔	1,37,350	18,70,676
	وہ فارم جو محض مزارعین کے زیر کاشت ہیں۔	2,11,993	17,22,573
صوبہ پنجاب	کل فارم	33,26,217	2,92,12,761

	وہ فارم جن میں مالک اپنی اراضی کے علاوہ دوسری اراضی بطور مزارع بھی کاشت کرتے ہیں۔	6,22,786	71,80,443
	وہ فارم جو محض مزارعین کاشت کرتے ہیں۔	12,81,596	1,18,64,631
صوبہ سندھ (بشمول کراچی)	کل فارم	6,94,672	1,01,90,479
	خود کاشت فارم	1,50,056	32,29,799
	وہ فارم جن میں مالک اپنی اراضی کے علاوہ دوسری اراضی بطور مزارع بھی کاشت کرتے ہیں۔	60,919	14,73,910
	وہ فارم جو محض مزارعین کاشت کرتے ہیں۔	4,83,727	54,86,770
بلوچستان	کل فارم	1,64,655	40,61,623
	خود کاشت فارم	1,00,779	24,53,847
	وہ فارم جن میں مالک اپنی اراضی کے علاوہ بطور مزارع بھی کاشت کرتے ہیں۔	13,202	4,86,565
	وہ فارم جو محض مزارعین کے زیر کاشت ہیں۔	50,674	11,21,211

ماخذ: گوشوارہ نمبر 2 پاکستان کے زرعی شماریات 1960ء

زرعی ملازمین کی تعداد

علاقہ	تعداد
مغربی پاکستان	7,03,870
صوبہ سرحد	48,492
صوبہ پنجاب	3,62,672

صوبہ سندھ	2,84,126
صوبہ بلوچستان	8,633

ماخذ: گوشوارہ نمبر46پاکستان کے زرعی شماریات1960ء

پیداواری اشاریہ مختلف اضلاع میں

ضلع	زیادہ سے زیادہ پیداواری اشاریہ	کم سے کم پیداواری اشاریہ	کل تعداد و محالات	تعداد محالات جن میں30 پیداواری اشاریہ سے کم ہیں
پشاور	100	14	77	22
ہزارہ	100	14	155	39
مردان	100	17	47	22
ڈیرہ اسماعیل خان	47	15	47	32
بنوں	62	15	37	24
کوہاٹ	---	10	77	35
حیدر آباد	42	17	33	19
نواب شاہ	34	11	24	19
لاڑکانہ	34	20	30	14
دادو	30	17	18	15
تھرپارکر	37	25	21	8
جیکب آباد	34	20	29	27
سکھر	34	17	36	30
ٹھٹھہ	24	14	24	24
خیرپور	40	31	5	---
سانگھڑ	39	22	12	6
کوئٹہ	62	16	18	12
پشین	66	13	17	11

ربّی	42	10	9	6
لاہور	108	20	51	11
سیالکوٹ	75	10	89	35
گوجرانوالہ	82	20	32	3
شیخوپورہ	82	26	47	5
گجرات	56	18	49	11
سرگودھا	88	18	38	9
جہلم	59	10	59	26
راولپنڈی	117	12	43	20
اٹک	100	17	29	10
میانوالی	40	10	41	22
ساہیوال	78	18	69	23
لائل پور	108	20	55	3
جھنگ	70	28	91	11
ملتان	80	14	198	72
مظفرگڑھ	50	16	64	28
ڈیرہ غازی خان	60	11	93	40
بہاولپور	100	9	52	21
رحیم یار خان	100	22	53	8
بہاول نگر	100	14	80	21

"بنجر قدیم" اور "غیر ممکن" اراضی کے پروڈیوس انڈیکس یونٹ کتابچے میں درج نہیں کیے گئے۔ مگر کتابچے کی تمہید میں اراضی کی ان اقسام کے پروڈیوس انڈیکس معلوم کرنے کا طریقہ درج کردیا گیا ہے۔ محال میں واقع جس اراضی کے کم سے کم پروڈیوس انڈیکس یونٹ ہوں گے، بنجر جدید کے پروڈیوس انڈیکس یونٹ اس کے برابر تصور کیے جائیں گے اور "بنجر قدیم" کے پروڈیوس انڈیکس یونٹ "بنجر جدید" سے نصف اور "غیر ممکن" اراضی کے ایک چوتھائی کے برابر ہوں گے۔

PakDigestNovels.Blogspot.Com

باب 38

بے زمین کاشت کاروں میں اراضی کی مفت تقسیم

پنجاب کے وزیر مال گزاری' آبپاشی اور توانائی مسٹر محمد انور سمہ نے 22 فروری 1973ء کو پنجاب اسمبلی میں بتایا کہ زرعی اصلاحات کے تحت چھ ہزار زمیندار دو لاکھ گیارہ ہزار ایکڑ کا اعلان کر چکے ہیں۔ اس میں سے ایک لاکھ 69 ہزار ایکڑ اراضی کمیشن نے واگزار بھی کر لی ہے۔ ملکیت کا اعلان کرنے والے زمینداروں کی تعداد سب سے زیادہ ملتان میں (847) اور سب سے کم سیالکوٹ میں (45) رہی۔

31 دسمبر 1972ء تک 1823 کاشت کاروں کو 8700 ایکڑ زمین پر مالکانہ حقوق دیے گئے۔ فائدہ اٹھانے والوں میں سب سے زیادہ تعداد (332) ڈیرہ غازی خاں میں اور سب سے کم سیالکوٹ میں رہی۔

ہر کاشت کار کو زیادہ سے زیادہ ساڑھے بارہ ایکڑ دیے گئے ہیں۔

مصنف کی اطلاع کے مطابق اب تک اڑھائی ہزار بے زمین کاشت کاروں کو مالکانہ حقوق مل چکے ہیں۔ اراضی کمیشن نے 1,84,668 ایکڑ واگزار کیے۔ لیکن ان میں سے صرف 11,429 ایکڑ تقسیم ہو چکے ہیں کیونکہ 1,29,656 ایکڑ کی ملکیت مشترک ہے اور ابھی دعاوی کی چھان بین ہو رہی ہے۔ واگزار اراضی میں سے 55,002 ایکڑ ایسے ہیں جن پر "واحد مالک" قابض تھے۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات پر مندرج اعداد و شمار سے ظاہر ہے' پنجاب میں اراضی کمیشن زیادہ سے زیادہ دو لاکھ ایکڑ واگزار کر سکے گا۔ اس کے علاوہ کمیشن کے پاس 6,42,320 ایکڑ سرکاری اراضی بھی تقسیم کے لیے موجود ہے۔ اس میں سے 4,28,998 ایکڑ مزروعہ' 1,37,575 ایکڑ غیر مزروعہ اور 75,657 ایکڑ ناقابل کاشت ہے۔

آخری اطلاع کے مطابق (2 مارچ 1973ء) سندھ میں دو لاکھ ایکڑ بے زمین کاشت کاروں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ خیال ہے کہ اس سے اٹھارہ ہزار کنبوں کو فائدہ پہنچے گا۔

حکومت کے ایک فیصلہ کے مطابق جو زمین پٹہ پر زمینداروں نے لے رکھی ہے اس کی تجدید نہیں کی جائے گی۔

اس مرتبہ جو زمیندار سرکار کے حوالے کرنے کے لیے صرف بنجر زمینوں کا اعلان کرے گا' اسے سات سال بامشقت قید دی جا سکے گی۔

بے زمین کاشت کاروں کو جو اراضی تقسیم کی جا رہی ہے اس کے لیے ایک سند جاری کی جاتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

"ملک میں کسانوں کا وقار بحال کرنے کے لیے صدر ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے وعدے کے مطابق یہ قطعۂ اراضی آپ کو بلاقیمت دیا ہے۔ (اراضی نمبر-----) تاکہ آپ اور آپ کے خاندان کے افراد اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ آج سے آپ آزاد ہیں"۔